## شخصیت اور فن

ظفر محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# جوش ملیح آبادی

## شخصیت اور فن


ظفر محمود


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 1988

تیسری اشاعت : 2013

تعداد : 550

قیمت : -/33 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 588

Josh Malihabadi
by
Zafer Mehmood

ISBN: 978-81-7587-352-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر:26109746، فیکس:26108159
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔006 110
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho (Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے

ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

**ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین**

**ڈائرکٹر**

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظؔ و خیّامؔ ہے ساقی

اپنے والدین کے نام
احترام اور عقیدت کے ساتھ

# ترتیب :

# حرفِ چند

جوشؔ اردو نظم کا ایک اہم ترین نام ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک وہ زرے لفاظ ہیں، بعض کے خیال میں انھیں محض لفظ بُننا اور چُننا آتا ہے ان کی شاعری بالخصوص شعری حس سے معرّیٰ ہے۔ بعض انھیں طنزیہ طور پر محض قادر الکلام کہتے ہیں اور بعض نے انھیں "اس دور کے سب سے بڑے شاعر" کا خطاب دیا ہے۔ جوشؔ نے خود کو "شاعرِ انقلاب" بھی کہا ہے لیکن نقادوں کا ایک گروہ ان کی اِسی انقلابیت کو سرسری قسم کی بغاوت سے موسوم کرتا ہے اور یہ بغاوت بھی وہ ہے جو کسی نظامِ فکر سے عاری ہے محض نعرہ بازی، انقلابیت کی شناخت نہیں ہے لیکن نقادوں کی ایک پوری جماعت ہے جو انھیں انیسؔ اور نظیرؔ کے سلسلے کی کڑی گردانتی ہے۔ کوئی ان کا نام اقبالؔ کے بعد لیتا اور کوئی سرے سے ہی ان کا منکر ہے۔ گویا جوشؔ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہیں۔ ظاہر ہے مسئلہ شاعری بنتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہر بڑا یا اچھا شاعر ایک سوال ہی نہیں ایک مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ ہر نقاد اسے اپنے طور پہ سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ بعض نکات اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور بعض کی تفہیم اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حالیؔ کے غالبؔ اور اکرامؔ کے غالبؔ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق طرزِ احساس کے باعث بھی پیدا ہوا نیز یہ فرق اس امر کی بھی علامت ہے کہ ذہنِ انسانی ہمیشہ جدلیت پسند رہا ہے۔ سائنس اور مختلف علوم میں جو زبردست تحقیقات عمل میں آ رہی ہیں اعلم کے جو نئے گُر دریافت ہو رہے ہیں۔ ذہنِ انسانی ان سے دوچار ہی نہیں متاثر بھی ہے مرعوب بھی۔ شعر فہمی بھی نئی حیثیت، ہمیشہ نئی آگاہیوں کو

ترغیب دیتی ہے اور اس طرح تنقید قدیم کو نئے معنی عطا کرتی ہے۔ نئے نام سے موسوم کرتی ہے
جوش ان معنوں میں اگر ایک مسئلہ بھی ہیں تو اس سے ان کی توقیر اور وقعت ہی میں اضافہ
ہوتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جوش کی عظمت کے انکار میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔
لیکن معروضی طور پر ان کی تحلیل بہت کم کی گئی ہے جس طرح جوش کو محض جذباتی اور ہیجانی کہنے والوں
کی کمی نہیں اسی طرح ہیجانی گفتار کے عادی نقادوں کی تعداد بھی وافر ہے جو دلیل سے کم اور حجت سے
زیادہ کام لیتے ہیں اسی باعث ان کی زندگی میں تو کیا ان کی وفات کے بعد بھی ایسی کسی کتاب کا
نام یاد نہیں آتا جس میں ان کے فکر و فن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گیا ہو۔

جوش کی شخصیت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے کہ ایک مختصر مقالے میں اس کا احاطہ کرنا
دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں نے اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن مجھے اپنے عجز کا اعتراف
ہے۔ حال ہی میں جوش پر دو ایک کتابیں آئی ہیں۔ امید ہے کہ ابھی جوش پر کئی کتابیں لکھی جائیں گی
اور جوش شناسی کی اپنی اپنی سی کوششیں کی جائیں گی۔ ان کا شعری سرمایہ تقریباً نصف صدی سے
زیادہ پر محیط ہے اس کا ادراک اور پرکھ آسان کام نہیں، تاہم امید ہے کہ میری یہ طالبعلمانہ
کوشش جوش اور ان کی شاعری کے مرتبے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

ظفر محمود

# جوشؔ کا سفرِ زندگی

کسی بھی زبان کے شاعر یا ادیب کو سمجھنے کے لئے یا اس کے فن کا مقام متعین کرنے کے لئے اس کی نجی زندگی ہی نہیں بلکہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کا فن ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا جن میں اس نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا عرصہ بسر کیا ہے۔ بہر طور سیاسی، سماجی اور معاشی حالات اس کے ذہن کی ساخت پر برابر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور یہ اثر بالآخر اس کے فکر و فن کی تکمیل و تعمیر میں ایک اہم ترین کردار انجام دیتا ہے دراصل جوشؔ کی شاعری اور شخصیت کی داستان اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ جوشؔ کو اور جوشؔ کی شاعری کو مکمل طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں ان کی زندگی کے حالات اور ان پیچیدہ راستوں پر بھی نظر رکھنی پڑے گی جن پر چل کر جوشؔ شبیر احمد خاں سے شبیر حسن خاں جوشؔ بن گئے۔

جوشؔ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مورخین ادب میں تضاد ہے۔ کوئی ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ء لکھتا ہے تو کوئی ۱۸۹۶ء اور کوئی ۱۸۹۸ء۔ مثلاً خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا ہے،

"شبیر حسن خاں جوشؔ ۱۸۹۴ء میں اودھ کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔"[1]

ڈاکٹر فضل امام جوشؔ کے بھتیجے کے حوالے سے لکھتے ہیں،

---

[1] بحوالہ جوشؔ نمبر "ساقی" کراچی ۱۹۶۳ء ص ۱۰۵

"جوش ان کے والد نواب محمد یوسف خاں سے چار پانچ برس چھوٹے تھے
یوسف خاں کا سنِ ولادت جوش کے بھتیجے کے بیان کے مطابق ۱۸۸۶ء ہے
لہٰذا اس سے جوش کا سنِ ولادت ۱۸۹۰ء یا ۱۸۹۱ء قرار پاتا ہے۔"[1]
خود جوش نے ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ایک مسودے پر اپنی تاریخ پیدائش اس طرح درج کی ہے،

"ایں جانب کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء وقت پیدائش صبح چار بجے۔"[2]

"یادوں کی برات" میں اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں؛

"میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ البتہ میری دادی جان جو خاندان کی مورخ تھیں انھوں نے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا یا ۱۸۹۸ء یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ اس لئے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا.... البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی ماں نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔"[3]

ان تحریروں کو پڑھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جوش کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مورخین اردو ادب ہی نہیں بلکہ خود جوش بھی تضاد کے شکار رہے۔ مگر جوش تضاد کے شکار کیوں رہے انھوں نے اس بات کو واضح کر دیا ہے۔

بہر حال جس وقت انیسویں صدی اپنی آخری دہائی کو پورا کر رہی تھی لکھنؤ کے قریب واقع ملیح آباد میں صبح چار بجے کے سہانے وقت آموں کے موسم میں کوئلوں کی کوک اور بوئے مستانہ سے سرشار موسم میں ایک حسن پرست جمال دوست شاعر جنم لے رہا تھا۔ یوں تو دنیا میں لاکھوں لوگ روزانہ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں مگر کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں

---

۱۔ شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی ۱۹۷۷ء ص ۱۵
۲۔ مجلہ جوش نمبر "افکار" کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۶
۳۔ "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۱۸

جن کی یادیں صدیوں تک لوگوں کے دلوں میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔ اور زمانہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر پاتا ایسی ہی ایک شخصیت کا نام شبیر حسن خاں جوشؔ ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں زمانہ اور ماحول کے ساتھ ساتھ خاندانی خصوصیات بھی کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جوشؔ نے افغانی نسل کے ایک پٹھان خاندان میں جنم لیا تھا۔ ان کے بزرگوں کی تلوار و قلم سے برابر کی دوستی تھی جس کا ذکر جوشؔ نے فخریہ انداز میں بار بار کیا ہے۔ جوشؔ کی ابتدائی زندگی اعلیٰ حلقوں میں بسر ہوئی اس کا احساس ہمیں ان کی زندگی کے ساتھ شاعری میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

جوشؔ کے پردادا کا نام نواب فقیر محمد گویاؔ تھا۔ فقیر محمد گویاؔ نواب ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست و ادب نواز بھی تھے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے اس زمانے کے شعراء میں فقیر محمد گویاؔ بھی کافی مقبول ہوتے ان کا شعری مجموعہ "دیوانِ گویا" کے نام سے مشہور ہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فقیر محمد گویاؔ نثار بھی تھے انھوں نے "انوارِ سہیلی" کا ملخص ترجمہ "بستانِ حکمت" کے نام سے کیا تھا۔

جوشؔ کے دادا نواب احمد خاں احمدؔ بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہوتے ہیں۔ ان کا دیوان "مخزنِ آلام" کے نام سے چھپ بھی چکا ہے انھیں بھی اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

جوشؔ کے والد نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ بھی شعر و ادب کے استاد تھے بقول جوشؔ ان کے گھر بارہ مہینے کوئی نہ کوئی ادیب یا شاعر مہمان رہا کرتا تھا اور آئے دن محفلیں و مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے بشیرؔ نے کم اشعار کہے مگر ان کا کلام شگفتہ اور کیف آگیں ہے۔

بشیرؔ کے کلام کو ان کے بڑے بیٹے نے ۱۹۱۲ء میں ترتیب دے کر "کلامِ بشیر" کے نام سے شائع کیا۔ جوشؔ کے والد نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔

باپ، دادا اور پردادا سب کے سب رئیس، اور نواب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور علم دوست بھی تھے۔ اب جوشؔ ان سب پر کیوں نہ فخر کریں۔ انھوں اپنے آبا و اجداد کے خاندانی پٹھان ہونے اور قلم و تلوار سے برابر کی دوستی ہونے کا ذکر کئی جگہ فخریہ انداز میں کیا ہے ان کے مجموعے "الہام و افکار" کی پہلی نظم "میرے اجزائے فکر" میں بھی انھوں نے ان باتوں کو واضح کیا ہے۔

میرا یہ نام ہے جو ذرا سا، اس امر میں
شامل فقط زمیں ہی نہیں، آسماں بھی ہے
اس منزلت میں مرحمتِ ملحداں کے ساتھ
کچھ عنصرِ نوازش روحانیاں بھی ہے
طبعِ رسا کی زلف دوتا میں گندھا ہوا
میرا تسلسلِ ادبِ خانداں بھی ہے
کچھ میرزائیاں بھی ہیں طرزِ سخن کے ساتھ
اور کچھ ستیزہ کاریٔ افغانیاں بھی ہے

یہ تھا بھی ایک پر رعب اور ذیشان و معزز خاندان۔ اس خاندان کے چشم و چراغ ہونے پر اگر جوشؔ فخر کرتے بھی ہیں تو بے جا نہیں ہے۔

جوشؔ نے حسبِ دستورِ قدیم ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اپنے اساتذہ سے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، نیز دیوانِ حافظ وغیرہ کا درس لیا۔ جوشؔ نے اردو کی تعلیم مولوی طاہر علی سے، عربی مولوی قدرت اللہ بیگ سے، فارسی مولوی نیاز علی سے اور انگریزی ماسٹر گومتی پرشاد سے پڑھی۔ یہ سبھی استاد اس زمانے کے اودھ کے مانے ہوئے عالم تھے۔ خاص طور سے مولوی قدرت اللہ بیگ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں قدرت رکھتے تھے ان کی ایک مثنوی بے نقط ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل جوشؔ کے پاس تھی اس بے نقط مثنوی کو اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ ان معلموں کے علاوہ حضرت مانی جائسی اور مرزا ہادی رسوا جیسے عالم بھی جوشؔ کے اتالیق تھے۔ جوشؔ نے سیتاپور، حسین آباد ہائی اسکول، جوبلی ہائی اسکول، مشن اسکول اور آگرہ کے اسکولوں کے علاوہ علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں بھی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے ٹیگور کے شانتی نیکیتن میں بھی رہے۔ مگر جہاں تک باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہے اس سلسلے میں جوشؔ کامیاب نہ ہو سکے۔ باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کر سکنے کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں رئیس زادوں کو اپنے آبا و اجداد کی عظمت کا احساس ہر وقت حاوی رہتا تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ رسمی تعلیم تو درمیانی طبقے کے لوگ بھی حاصل کر کے اپنا نام کر لیا کرتے ہیں۔ جوشؔ بھی ایک رئیس گھر کے چشم و چراغ تھے ان پر بھی اس بات کا اثر تھا مگر مکمل باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا صدمہ انھیں عمر بھر رہا۔

جوشؔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہوں یا نہ رہے ہوں مگر جہاں تک تحصیل علم کا سوال ہے اس کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا حصول علم کا ذکر کرتے ہوئے "یادوں کی برات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عشق کی طرح مجھ کو حصول علم کا چسکا لڑکپن ہی سے تھا...... میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعر کی تخلیق، علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔"[1]

جوشؔ کے گھر پر اکثر مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعران کے گھر آیا کرتے تھے۔ شاعرانہ چشمکیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ادبی مباحث بھی ہوا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کی گھٹی میں شاعری تھی ان کا خمیر ہی شاعری کا بنا ہوا تھا۔ شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی۔ ادھر باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا ان کے دل پر بڑا اثر تھا۔ آخر جوشؔ نے اپنی ساری توجہ شاعری کے فن میں کمال حاصل کرنے میں لگا دی۔ ایسے ذہین آدمی کی خصوصیات بچپن میں ہی نمایاں ہو جایا کرتی ہیں۔ اور جوشؔ بھی ایک ذہین انسان تھے انھوں نے بھی اپنے جوہر بچپن سے ہی دکھانا شروع کر دیئے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نو برس کی عمر سے ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور نو برس کی عمر میں جو پہلا شعر کہا وہ یوں ہے

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فنِ خاندانی ہے

"یادوں کی برات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"نو برس کی عمر سے ہی شعر کی دیوی نے مجھے اپنے آغوش میں لے کر مجھ سے شعر کہلوانا شروع کر دیا تھا۔"[2]

جوشؔ کے والد نواب بشیر احمد خاں نہیں چاہتے تھے کہ جوشؔ بھی شاعر بنیں انھیں یہ ڈر تھا کہ ان کے بعد ان کا بیٹا بھی شاعر ہو گیا تو وہ اپنی جاگیر پر اپنی توجہ پوری طرح مرکوز نہیں رکھ

---

[1] "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۹

[2] "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۹۲

سکے گا اور دھیرے دھیرے ہماری پشتینی چلی آرہی جاگیر ختم ہو جائے گی۔ اور آخر ہوا بھی یہی۔ اسی لئے وہ جوشؔ کو شاعر بنانا نہیں چاہتے تھے مگر انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کا یہ بیٹا جاگیر سے بڑا نام اپنی جاگیر میں کرنے والا تھا۔ جوشؔ کے والد نے ان پر پابندیاں عائد کر دیں کہ وہ شعر نہ کہیں گھر کے ایک ایک نوکر کو خبردار کر دیا کہ وہ ان پر نظر رکھیں کسی ملازم سے اطلاع مل جانے پر جوشؔ کے والد کو معلوم ہو گیا کہ جوشؔ کے صندوق میں شاعری کے کاغذات رکھے ہیں۔ انھوں نے صندوق کھول کر سارے کاغذات پھاڑ ڈالے جوشؔ نے جب اپنی شاعری کے پرزے پھٹے ہوتے دیکھے تو لکھتے ہیں:

"میرے منھ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا......
مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھے گلے لگا کر ارشاد فرمایا۔ بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی؟"[1]

جوشؔ کے والد نے بیٹے کے ذوقِ شعر اور شوقِ سخن کو دیکھ کر شعر کہنے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا ہادی عزیزؔ لکھنوی کے سپرد بھی کر دیا اس زمانے میں عزیزؔ لکھنوی کی غزلوں کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ بڑے غزل گو شاعر اور زبان و بیان کے مانے ہوئے استاد تھے۔ ان کی شاعری کی بڑی خصوصیت جذبات نگاری تھی۔ یہ رشتہ تلمذ ۱۳-۱۹۱۲ء میں قائم ہوا اور چار پانچ سال کی مدت کے بعد ختم ہو گیا۔

اس رشتہ تلمذ کے ختم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عزیزؔ لکھنوی استاد ہونے کے باوجود جوشؔ کی بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ جبکہ جوشؔ نئی زندگی کے اثرات قبول کر رہے تھے اسی بنیادی فرق کی وجہ سے استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا مگر جوشؔ کی ابتدائی غزلوں میں عزیزؔ لکھنوی کا رنگ جھلکتا ہے۔

جوشؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی مگر غزل ان کی طبیعت کی جولانی کو اپنے حدود میں سمیٹ نہ سکی اور جوشؔ ان دنوں غزل سے کچھ رخ بدلنا بھی چاہتے تھے کہ انھیں دنوں ملیح آباد میں سلیم پانی پتی کا قیام ہوا اور بس کیا تھا تنکے کو ہوا کا سہارا چاہیئے تھا ان کی طبیعت سخن نے ایک نیا موڑ لیا جوشؔ اس بات کا انکشاف پروفیسر احتشام حسین صاحب کو ایک

---

[1] بحوالہ "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۱

خط میں یوں کرتے ہیں،

"سلیم صاحب نے غالباً ۱۹۱۲ء یا اس سے کچھ پیشتر غزل گوئی پر فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مجھے نظم گوئی پر آمادہ کیا۔ اور انھیں کی فرمائش سے چونکہ وہ محرم کا زمانہ تھا میں نے سب سے پہلی نظم "ہلالِ محرم" کے نام سے لکھی تھی جو تلف ہو چکی ہے۔"[1]

۱۹۱۶ء میں جوشؔ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ایک طوفان سا ان کی زندگی میں آگیا دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں نے نگاہیں پھیر لیں۔ زندگی سنسان و ویران نظر آنے لگی اور جوانی کی پہلی سیڑھی یعنی شادی بھی ہو گئی تو خانگی دنیا کے مسائل نے بھی جوشؔ کو آگھیرا ادھر جوشؔ۔ حافظؔ، ٹیگورؔ، اور خیامؔ سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہی سب حالات نے انھیں دنیا کی بے ثباتی کا احساس بھی کرا دیا تھا۔ اسی لئے ان کے پہلے مجموعے "روحِ ادب" کی پہلی نظم "ترانۂ بیگانگی" اس کیفیت کی ترجمان ہے۔ ابتداً تحریر کرتے ہیں۔

"دوسرے عالم میں ہوں دنیا سے میری جنگ ہے"

اور پھر کہتے ہیں۔

زہر لگتی ہے زمانے کی مجھے آب و ہوا
ظاہری اسباب کو چھوڑے زمانہ ہو گیا

مال و دولت اقربا، احباب یار و آشنا
چوٹ کھائی ہے سے دل پر میں نے یہ سب تج دیا

شمع وہ پردے میں ہے جس شمع کا پروانہ ہوں
انتہا یہ ہے کہ اپنے سے بھی میں بیگانہ ہوں

اس دور کی شاعری ان ہی خیالات سے بھری پڑی ہے اس دور میں غمِ دوراں ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور بہت جلد ہی اس نے دنیا کے تمام ممالک کو کسی نہ کسی شکل میں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندوستان پر بھی اس جنگ کے گہرے اثرات

---

[1] بحوالہ جوشؔ نمبر "افکار" کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۱۳

مرتب ہوئے۔ ان حالات میں جوشؔ جیسا حساس اور بیدار ذہن رکھنے والا شاعر صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے دور کے حالات سے چشم پوشی اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس دور ہی سے ان کی شاعری میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئیں۔ اس دور کی نظمیں ان کی ذہنی کشمکش اور عام سماجی و سیاسی بحران کی بہترین عکاس ہیں۔ انھوں نے جنگ کے زمانے میں جو نظم "حالاتِ حاضرہ" کہی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں جوشؔ کو اچھی طرح احساس ہوگیا تھا کہ یہ غم ان کے اپنے غموں سے بڑا ہے اسی لئے انھوں نے "حالاتِ حاضرہ" میں لکھا۔

سلطان بڑھے ہیں دہر میں لشکر لئے ہوئے
اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لئے ہوئے

"حالاتِ حاضرہ" کو پڑھنے کے بعد ہمیں ہندوستان کے حالات کا بھی پتہ چلتا ہے اس وقت ایک طرف تو جنگ کے اثر سے ہندوستانی عوام خوف زدہ تھے تو دوسری طرف قحط، بھکمری نے سیکڑوں کی جانیں لے لی تھیں۔ اس نظم سے بین الاقوامی حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک کے درمیان جوشؔ کا دل بڑی حد تک زندگی کی لذتوں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ "طوفانِ بے ثباتی"۔ "گریۂ حسرت"۔ "تیر قہر عرفاں"۔ "دنیا ناپائیدار"۔ "سانس لو یا خوش رہو"۔ "انتظار کے آخری لمحے" وغیرہ نظمیں اس تاثر کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس دور کے بعد جوشؔ کے مزاج اور طبیعت میں پھر تبدیلی رونما ہوئی اور وہ کا سب رومانیت کی طرف مائل ہوگئے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ان کے یہاں محبت اور عاشقی کا زمانہ ہے اس زمانہ میں وہ سب سے بے خبر اپنے عشق، حسن، وفا، بے وفائی اور قربت و وصل کے چکروں میں مبتلا رہے۔ ان کی اس زمانے کی شاعری انہی باتوں کی غمازی کرتی ہے۔ جوشؔ نے رومانوی شاعری میں بھی اپنے فن کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس زمانے میں وہ ٹیگور سے مل چکے تھے ملیح آباد کی فضا میں حسن فطرت کی اپنی شان تھی جوشؔ بیدار و حساس نگاہ رکھتے تھے انھوں نے اپنے گرد و نواح کے ہر نقش کو اپنی روح میں بھی رقم کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "عاشق نواز"۔ "چاند کے انتظار میں"۔ "جفائے وفا"۔ "پہلی مفارقت"۔ "زرد کیاں" وغیرہ نظموں میں وہ ایک فطرت پرست اور نوجوان عاشق کے طور پر ابھرے ہیں۔ "پھول"۔ "تم سے کیا

کہتے ہیں: "تجاہلِ عارفانہ" وغیرہ یہ سب نظمیں اسی نوع کے موضوعات کی غمازی کرتی ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب ان کی محبوبہ کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کے دل پر جیسے بجلی گر جاتی ہے۔ ان کا دل زخمی ہو جاتا ہے۔ "شادی مرگ" اور "نقش و نگار" جیسی نظم پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے دل پر بڑا زخم لگا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دبائی حسنِ خجستہ خو کی کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
بچھڑے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے
ادھر نفیری کی مست لہریں لیے ہوئے ہیں پیامِ شادی
ادھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سنا رہی ہے
ادھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پہنا رہی ہے

۱۹۲۴ء جوش کی زندگی میں بڑی تبدیلی کے نشان کی حیثیت رکھتا ہے اس سن میں جوش نے ملیح آباد چھوڑ کر حیدر آباد کا رخ کیا۔ اور اب تک رئیس میں پلا بڑھا آدمی اب ملازمت پر مجبور ہو گیا۔ ملیح آباد چھوڑنے کی کئی وجہ ہیں مگر اس میں تلاش معاش کے ساتھ ہی ساتھ عشق کو بھی بڑا دخل ہے۔ حیدر آباد آنے سے جوش کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا ماحول بدل گیا دنیا بدل گئی۔ مگر ساتھ ہی ملیح آباد چھوڑنے کا غم بھی ہوا۔ ملیح آباد اور خاص کر ان کے مکان "قصر سحر" اور لکھنؤ انھیں ان تینوں سے بڑی محبت تھی۔ ان کے چھوٹنے کا غم ہمیں ان کی نظم "الوداع" میں نظر آتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز جوش کا دامن تھام رہی ہے۔ مگر جوش ہیں کہ ان سب سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں جوش ملیح آباد چھوڑنے کا سبب دانستہ چھپاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے فکر روزگار کے باعث انھوں نے یہ مسافت طے کی ہو کیونکہ جوش نے اس نظم میں فکر روزگار کا ذکر بار بار کیا ہے۔

ملیح آباد چھوڑنا جوش کے لئے مفید مطلب رہا۔ وہ حیدر آباد میں دار الترجمہ میں ناظر ادب ہو گئے زندگی کی کشمکش نے نئی صورتیں اختیار کر لیں۔ گھر سے دور رہنے کا مزہ بھی ملا دل میں نئی طرح کا گداز پیدا ہوا۔ نئے نئے تجربے ہوئے۔ دوست احباب بدلے صبح و شام بدلے صحبتیں بدلیں۔ اس بدلاؤ نے جوش کی طبیعت کو پہلے سے زیادہ رنگا رنگ بنا دیا۔ وہ "یادوں کی برات" میں لکھتے ہیں۔

"اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ شعبۂ دارالترجمہ کی وابستگی سے مجھے بے حد علمی فائدہ پہنچا یا، اور خصوصیت کے ساتھ علاّمہ عمادی، علاّمہ طباطبائی اور مرزا ہادی رسوا کے فیضان محبت نے مجھ جیسے بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوقِ مطالعہ پر مامور کر دیا، اور صحتِ الفاظ و نجابتِ لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی، مرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہمنشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا۔" [1]

1919ء سے 1921ء تک ہندوستان میں انقلاب کی ہوائیں آ چکی تھیں جس کی وجہ سے ہندوستان کے اکثر نوجوان عیش و عشرت کے بستر سے اٹھکر جہد و جہد کے خارزار میں قدم رکھ چکے تھے۔ مگر جوشؔ پر ان ہواؤں کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ان کے کانوں میں رئیسی کے نغمے گونج رہے تھے۔ وہ محبوب اور اس کی نازبرداری اور دوستوں کے محدود حلقہ میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر وطن سے دور رہنے کے زمانے میں غلامی اور آزادی کی کشمکش نے ان کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ وطن سے دور ہو کر غلامی کی زندگی گزارنے پر انھیں ان سب باتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ یہ زمانہ جوشؔ کے ذہنی ارتقا کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ کام کے سلسلے میں اور کچھ ذوق و شوق کے باعث جوشؔ نے بے شمار کتابیں پڑھیں۔ ان کی پڑھنے کی رفتار بھی تیز ہو گئی اور رومانوی قصے کہانیوں سے ہٹ کر جوشؔ نے تاریخ، فلسفہ، اخلاقیات اور دوسرے علوم کی سیکڑوں کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ دارالترجمہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے مباحثے بھی ہوا کرتے۔ اس وجہ سے جوشؔ میں آج اور کل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی۔ ملیح آباد میں ابتدا میں یا تو شراب کا ذکر ہی نہ تھا یا تھا بھی تو رسمی تھا۔ مگر اس زمانے میں انھوں نے "چند جرعے" اور "پیامِ کیف" کی سی مدہوش نظمیں لکھیں۔

جوشؔ کی اس تبدیلی یا اس باغیانہ میلان کا ایک سماجی اور سیاسی پس منظر بھی ہے ہندوستانی سماج میں اصلاح پسندوں کے اٹھائے ہوئے ضمیر نے ایک لمبی کوشش کے بعد ایک طویل مدت میں نئی انقلابی قدریں پیدا کر دی تھیں جن کا وجود پہلی جنگ عظیم کے

---

[1] "یادوں کی برات" آئینہ ادب مکتبہ ص۵۰۔۵۵۱

بعد ہوا تھا۔ برطانوی استحصال نے ہندوستانی افلاس کو اس نقطے پر پہنچا دیا تھا کہ جس کے آگے صبر و قناعت کی راہ مسدود تھی۔ بین الاقوامی حالات بھی آزادی کے جذبات پر مہمیز کا کام کر رہے تھے۔ ہندوستان میں اس وقت انگریزوں کی طرف سے کئی اصلاحات کی گئیں۔ مگر ان اصلاحات سے کوئی مطمئن نہیں تھا۔ متوسط طبقہ خاص طور سے غیر مطمئن تھا۔ عوام بیدار تھے۔ ان سب عناصر نے مل کر ایک راستہ دکھایا تھا جو انقلاب کی طرف جاتا تھا۔ اس درمیان میں ادب میں رومانوی اور تغیر پسندی کی ایک ایسی لہر اٹھی تھی جس نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ شروع شروع میں جوشؔ اس سے بہت کم متاثر نظر آتے ہیں مگر بعد میں ان کی شاعری میں کہیں کہیں سیاسی سوجھ بوجھ بھی نظر آتی ہے۔ مگر جوشؔ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ان سب باتوں سے نظریں بچائے ہوئے تھے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اگر "شکستِ زنداں کا خواب" اور "خدا سے ایک سوال" جن پر سنِ اشاعت ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۷ء درج ہیں ان کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بڑے جرأتمندانہ قدم اٹھائے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس وقت انگریزوں نے ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ اتحاد نہ ہو سکے۔ لوگ فرقہ پرستی اور مذہبیت کے چکروں میں آکر ایک نہ ہوں۔ اسی لئے اس وقت فرقہ وارانہ لڑائیاں بھی ہوئیں پھر ہندوستان کو ایک جھٹکا لگا۔ ملک میں قحط آیا۔ جوشؔ نے ۱۹۱۸ء میں قحط کے وقت خشک سالی پر نظم لکھ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ان سب باتوں سے بیگانہ نہیں تھے۔ اپنی نظم "وطن" میں قوم اور ملک سے یہ وعدہ کر لیا کہ

تیری خدمت میں جان دیدوں گا

مگر اس کے باوجود جان دینے کا جذبہ ان میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کی نظم "ترکِ جمود" سے انہیں شاعر کی حیثیت سے اپنے فرض کا احساس ہوا۔ اور انھوں نے لکھا۔

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملّت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
ہوا ہے حکم کرے کام موجِ صرصر سے
اب اختلاطِ نسیمِ سبک خرام کہاں
ہوا ہے حکم کہ بن رازدانِ آتش و برق

اب آب جبینِ گلِ خوبانِ لالہ فام کہاں

۱۹۲۰ء سے جوشؔ کے کلام میں ملکی اور غیر ملکی مسائل نے جگہ پانا شروع کر دیا تھا جوشؔ نے اپنی نگاہوں کو حقیقت کی طرف مرکوز کر دیا۔ محبوبہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑنے لگی تھی اور چہرہ خوباں اور تماشائے حسن و بام کو ترک کر کے ملک و ملت کی رنگت کا عکس ان پر نمایاں ہونے لگا تھا اور کچھ ہی دنوں میں اپنی نظموں کے تیر لے کر میدان میں ایک سپاہی کی طرح اتر گئے اور ایک دم یہ کہہ اٹھے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اس زمانہ میں ہندوستان کے عوام میں آزادی کے لیے اتحاد کی لہر دوڑ گئی تھی مگر تنگ نظری اور فرقہ وارانہ ذہنیت ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کبھی اتحاد نظر آتا کبھی پھوٹ اور ایک دور ایسا آیا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی لہر سے پورا ہندوستان لال نظر آنے لگا یہ کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک طرف آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک ہو جانے کے نعرے اور دوسری طرف آپسی مذہبی اور ذاتی تفرقوں نے فسادات کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کا بڑا ثبوت کانپور کا فساد ہے۔ جوشؔ نے کانپور کے فساد پر ایک نظم کہی جس کا عنوان "مقتلِ کانپور" ہے جوشؔ نے اس نظم میں ایسے لوگوں پر لعنت ملامت کی جو غریبوں کے خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔

یہ زمانہ جوشؔ کے لئے عجیب و غریب تجربے کا حکم رکھتا تھا۔ اس زمانے میں جوشؔ کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کچھ عجیب سی ہو گئی تھیں۔ کبھی روشن مستقبل کی امیدیں حوصلہ بڑھاتی تھیں تو کبھی یاس و نا امیدی کے ڈراؤنے سائے سے منڈلاتے نظر آتے تھے اس دور کی شاعری اسی کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے۔ جذبات کو عقل کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت جوشؔ کا مطالعہ بھی وسیع ہو گیا تھا اور ذہن میں تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں جوشؔ نے سائنس، تاریخ اور فلسفے کا بھی مطالعہ اس زمانے میں کیا تھا اور وہ جذبات کو سماجی حقائق کی راہ پر لانے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اب تک وہ یہ سمجھتے تھے کہ جوانی کا مطلب یہ ہے کہ اسے محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ اس دور میں انھیں کارزارِ حیات یعنی میدانِ عمل میں اترنے کا بھی خیال پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ جوشؔ کے مطالعہ، مشاہدہ اور

تجربات وخواہشات نے ان کو دنیا اور اس کی وسعت کا اس طور اندازہ کرا دیا تھا کہ ان میں سے ہر چیز ان کی شاعری کا موضوع بن گئی تھی۔

سن ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی جنگ آزادی ایک خاص موڑ پہ پہنچ گئی تھی۔ سارے ہندوستان میں ایک ہل چل تھی۔ قوم پرستوں اور ان کے رہنماؤں نے ایک دن آزادیٔ کامل کا اعلان کر دیا کیونکہ اب تک جو مراعات اور سہولیات ہندستانی عوام کو دی گئی تھیں وہ سب انگریزوں کے مفاد کو مدنظر رکھ کر دی گئی تھیں۔ اب مکمل آزادی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا جوشؔ نے بھی "خریدار تو بن" اس طرح لکھی۔

اے دل آزادیٔ کامل کا خریدار تو بن
پہلے اس کاکلِ پیچاں کا طلبگار تو بن

اسی اثنا میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا مگر ہندوستانی عوام اور رہنما سمجھ چکے تھے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں ان کا جذبۂ آزادی اس طرح کم نہیں ہو سکا تو برطانوی سامراج نے گول میز کانفرنس جیسے اقدامات کئے۔ مگر یہ سب کھیل تھے جو برطانوی حکمراں ہندوستانی عوام سے کھیل رہے تھے۔ عوام اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ اب آزادیٔ کامل کے بغیر ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جوشؔ نے بھی حکومت کی ان چالوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک نظم سائمن کمیشن سے خطاب کرتے ہوئے "دامِ فریب" کے عنوان سے کہی جس میں عوام کو بتایا کہ۔

لگی ہے گھات میں مدت سے تیری، فرنگی کی نگاہِ جادوانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر، مہیا کر رہے ہیں آب و دانہ

ایک اور نظم "زوال جہاں بانی" میں بتلایا کہ

یہ بھی ایک صورت ہے تجھے بزدل بنانے کی

ان نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لے کر برطانوی سامراج کو بے نقاب ہی نہیں بلکہ کھلی لعنت و ملامت کر کے عوام کو ان سے متنفر بھی کر دیا ہندوستان کے رہنما سامراجی دام فریب میں نہ آسکے بلکہ انھوں نے تحریک آزادی کو تیز کرنے کی غرض سے ملک بھر میں "سول نافرمانی" اور قانون شکنی کے نعرے لگائے اور میدان عمل میں سرگرم ہو گئے۔ آزادی کا تصور واضح ہو جانے سے طبقاتی تضاد بھی ابھر کر سامنے آیا اور ہندوستان میں اشتراکیت کا چرچا بھی سنائی دینے لگا جوشؔ نے اشتراکیت کے خیالات کا

اظہار اپنی شاعری میں کرنا شروع کیا وہ شاہوں کی مدح وثنا کرنے کے بجائے اپنی شاعری
میں کسانوں اور مزدوروں کے قصیدے لکھنے لگے ۔ اپنی ایک مشہور نظم "کسان" میں کہتے ہیں۔۔

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے، دھندلے دھندلے سے چراغ

وہ ان موثر و سحر انگیز لفظوں میں شام اور اس کے کیف آگیں ماحول کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
یہ سماں اور ایک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

اور اس طرح کسان کو وارثِ اسرارِ فطرت، صبح کا فرزند، ماہِ کامل اور مہرِ عالم تاب
کا نورِ نگاہ قرار دیتے ہوئے یہ احساس دلاتے ہیں کہ

خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

اور جب وہ کسان کے ہل کی توصیف کرتے ہوئے قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
اور خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ اور اس میں ہلالِ عید کی درخشانی بتاتے ہوئے زمین

سے سونا اگلوانے کے لئے اس ہل کا لوہا منوا لیتے ہیں تب اس کی اپنی مایوس کن غم زدہ بھی زندگی کا منظر پیش کرتے ہیں۔

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منھ اترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

اور پھر سرمایہ داری کے خلاف ملامت کرتے ہوئے بپھر جاتے ہیں۔

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کم بخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

آخر میں وہ سرمایہ داری کو اس کا انجام بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

جوشؔ کے مزاج میں خاندان کی رئیسی کے اثرات بھی کافی طاقتور انداز میں موجود تھے مثلاً جب وہ حیدر آباد کی ملازمت میں تھے تب بھی نظام کو سرکار کہنے میں انھیں روحانی کوفت محسوس ہوتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"اس افتادِ مزاج کے ساتھ میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا ان کو سرکار کہتا اور ان کی زبان سے اپنے متعلق "تم" سنتا تو میرے ذہن پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلا اٹھتا تھا۔"[1]

---

[1] یادوں کی برات

غالباً حیدر آباد سے علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسری وجوہات بھی رہی ہیں بہرحال حیدر آباد سے واپسی ان کے لئے کچھ کم جاں گسل حادثہ نہ تھا۔ کیونکہ ان کے عشق کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس وقت کی نظموں میں نوحۂ فراق، "شامِ رخصت" "امروز یا فردا" وغیرہ میں یہ کیفیات موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

موت کے آغوش میں جینے کے ساماں کیا کروں
کیا کروں اے پیچ و تابِ شامِ ہجراں کیا کروں
سر میں اک سودا ہے اور وہ بھی سودائے عشق کا
دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی عریاں کیا کروں
بھاگتی ہیں راحتیں مجھ سے جدھر جاتا ہوں میں
اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں

حیدر آباد سے اخراج کے وقت نظام کا حکم تھا کہ کوئی رخصت کرنے اسٹیشن نہ جائے مگر ان کی محبوبہ جاتی ہے اس یاد کو جاوداں بنانے کے لئے جوشؔ نے اپنی نظم "شامِ رخصت" میں لکھا۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ تری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

اس طرح نوحہ فراق میں وہ کہتے ہیں۔

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے
میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھئے
ہنگام الوداع کسی کے دوش ناز پر
کیوں کھل پڑی تھی زلف پریشاں نہ پوچھئے
دیں اب بھی جوشؔ کو جو سہارے دیئے ہوئے
اس شوخ کے وہ عہدِ وپیماں نہ پوچھئے[1]

---

[1] "نوحہ فراق" حرف و حکایت ص۱۱

جب جوشؔ حیدرآباد جسے ملیح آباد کے بعد وہ دس سال تک اپنا مستقر بنا چکے تھے رخصت ہونے لگے تو واپس ملیح آباد جانے میں انھیں کچھ تامل یوں ہوا کہ بچوّں کو اب دیہات کی زندگی پسند نہیں تھی دوسرے وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹنے میں سبکی محسوس کر رہے تھے اور پھر جاگیر کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے ان وجوہات سے جوشؔ نے دہلی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور وہیں سے ماہنامہ "کلیم" جاری کیا جو عوام وخواص دونوں میں مقبول ہوا رسالہ جاری کر کے جوشؔ نے نثر نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا۔ دہلی کے قیام میں انھیں سیاسی رہنماؤں سے ملنے اور سرکاری نظام کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے تحریک آزادی شدید ہوتی جا رہی تھی نیا دستور ملک میں نافذ ہو رہا تھا انتہا پسند جماعتیں ابھر رہی تھیں۔ ترقی پسند مصنفین وجود میں آگئی تھی خود جوشؔ کی عمر پختگی کی منزل میں پہنچ گئی تھی انھیں "شاعر انقلاب" اور "شاعر اعظم" جیسے خطابوں سے نوازا جا چکا تھا۔ اسی زمانے میں ان کے دو مجموعے "شعلہ و شبنم" اور "نقش و نگار" شائع ہو کر مقبول ہو چکے تھے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس جو الہ آباد میں ہوئی تھی اس کی مجلسِ صدارت میں جوشؔ شامل تھے ان کے خطبہ صدارت سے بھی لوگ چونکے تھے۔ ان کی گھن گرج اور انقلابی آواز نے کافی بڑے حلقے کو متاثر کیا تھا۔ اسی دور میں ان کی رباعیات کافی تعداد میں شائع ہوئیں جن میں ان کی شاعری اور روح کی کشمکش صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اسی زمانہ میں "فکر و نشاط" اور "فنون حکمت" نام کے مجموعے بھی شائع ہوئے تھے۔

جوشؔ کو "کلیم" کے ذریعہ مقبولیت اور شہرت تو ملی مگر مالی منفعت حاصل نہ ہو سکی وہ پھر ملیح آباد چلے گئے اور وہیں سے "کلیم" کو بھی جاری رکھا جو زیادہ دن نہیں چلایا جا سکا پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی جوشؔ کی برطانوی سامراج سے دشمنی شدت اختیار کر گئی انھوں نے "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہند کے نام" لکھ کر اپنی انگریز دشمنی کا واضح ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت ہندوستانی عوام حکومتِ برطانیہ کو پریشانی میں دیکھ کر اس وجہ سے خوش ہوتے تھے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو اور ہندوستان کے مطالبات کو بار بار ٹھکرا دیا تھا اور جب انگریزوں نے جنگ میں ہندوستانیوں سے بھی مدد طلب کی اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے جوشؔ لکھتے ہیں کہ۔

"ایک روز جب میرا بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں

بیٹھا لکھنؤ کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سن رہا تھا جس میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر جنگ عظیم میں برطانیہ کی مدد پر کمربستہ ہو جائیں۔ اسی وقت میں نے یہ نظم "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب" پندرہ منٹ میں کہہ ڈالی۔[1]

اس نظم نے پورے ہندوستان میں ہلچل سی پیدا کر دی اور حکومت نے اس کو ضبط کر لیا۔ اس سلسلے میں جوشؔ کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی۔ جوشؔ نے اس اقدام پر برہم ہو کر پھر ایک نظم "تلاشی" عنوان پر لکھی جس میں کہا گیا تھا کہ تلاشی میرے گھر کی لینے سے کیا ملے گا۔ تلاشی ہی لینا ہے تو میرے دل کی تلاشی لو جہاں تمہارے خلاف غصہ کا طوفان بپا ہے۔ یہ نظم بھی اتنی مقبول ہوئی کہ بچوں کی زبان تک عام تھی۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد جوشؔ نے لکھنؤ میں مستقل طور پر قیام کر لیا اور اپنی طویل ترین نظم "حرف آخر" کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ اسی کے ساتھ "نقش و نگار" میں دی ہوئی نظم "پروگرام" کے مطابق زندگی گزارنے لگے۔ ادبی جلسوں اور دوست احباب کی صحبتوں میں دن کٹنے لگے۔ "حرف آخر" کے لئے مذہب، فلسفہ، سائنس وغیرہ کی کتابوں کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوئے۔

اسی درمیان میں جنگ نے ایک نئی کروٹ لی جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ اس سے لڑائی کی شکل ہی بدل گئی۔ ایک طرف سوویت روس، انگلستان، امریکہ، چین اور ان مفتوحہ تمام قوموں کی فوجیں تھیں جنہیں ہٹلر نے اپنے قدموں کے نیچے کچل دیا تھا۔ دوسری طرف جرمنی، جاپان اور مفتوحہ ممالک کے زرخرید غلام تھے۔ ایک شدید سی کشمکش تھی جس عالم میں ایک جذباتی انسان کے لئے فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ کیا کرے جوشؔ کے ذہن میں انگریز دشمنی تو بچپن ہی سے تھی وہ ایسی صورت میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

جاپان نے بھی اپنا خونی کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا، ملایا، برما، انڈو چائنا اور انڈونیشیا فتح ہو چکے تھے۔ اب جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ جوشؔ جاپان کے اس فوجی فاشزم سے متنفر تھے۔ لیکن چونکہ جاپان انگریزوں کا دشمن تھا اس لئے جوشؔ نے خاموشی اختیار کر لی۔ اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں انگریز سامراج نے ہندوستان پر زبردست وار

---

[1] بحوالہ یادوں کی برات، آئینہ ادب لکھنؤ ص ۲

کیا۔ اس نے ہندوستانی رہنماؤں کو خوفزدہ کرنے کے لئے انہیں جیلوں میں بند کر دیا عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ یہ گرفتاریاں اس وقت کی گئیں جب ہندوستانی رہنما بدلتے عالمی حالات کے پیش نظر انگریزوں سے قومی حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عوام نے خالی ہاتھوں حکومت کا تختہ الٹ دینے کی کوشش کی اور وہ ناکام ہو گئے انگریز حکومت نے انقلابیوں پر انسانیت کش مظالم کئے یہ ساعت یقیناً ایک عظیم آزمائش سے مماثل تھی خصوصاً ان ذہنوں کے لئے جن کی نظر حیات و کائنات پر گہری تھی جو اجتماعی سطح پر زندگی کو ایک نیا عنوان دینے کے در پے تھے۔ مگر انگریزوں کی غیر متوقع ستم رانیوں نے پوری قوم کو کچھ دیر کے لئے عضو معطل بنا کر رکھ دیا۔ ایک شاعر کی روح جو ہر چیز سے روشنی حاصل کرنے کی متمنی تھی اس پیچیدگی میں راستہ تلاش نہ کر سکی۔ جوشؔ بھی نیم خاموش سے ہو گئے۔ اس زمانہ میں جوشؔ نے جو نظمیں لکھیں ان سے جوشؔ کی ذہنی کشمکش اور تذبذب کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔ انھیں کچھ مایوسی ہے کچھ امید کبھی روشنی اور کبھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں "کشمکش پیہم" "آدمی نامہ" اور "نظام نو" وغیرہ سے یہی تاثر پیدا ہوتا ہے جوشؔ کشمکش میں مبتلا ضرور ہیں مگر امید کی کرن انھیں ابھی نظر آ رہی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ کامیابی ایک دن ضرور ملے گی۔

اسی درمیان جوشؔ کچھ عرصہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے بمبئی اور پونا میں رہ کر فلمی گیت لکھے جو کافی مقبول بھی ہوئے۔ انھیں یہاں بھی ہندوستانی سیاست کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ہندوستان کے زیادہ تر رہنما جیلوں میں بند تھے اور جو باہر تھے وہ برابر فاشزم کی مخالفت کر رہے تھے اس زمانے میں جوشؔ نے رباعیات بہت بڑی تعداد میں لکھیں۔ انھوں نے جو رباعیات اور نظمیں کہی ہیں ان کو پڑھنے سے سارے حالات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اسی وقت انھوں نے ایک اور معرکہ کی نظم "وقت کی آواز" لکھی جس میں وہ ہندوستان کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے آزادی سے متعلق مستقبل کی خوش آئند پیش گوئی کرتے ہیں۔ ایک اور نظم "مستقبل ہندوستان" میں وہ لکھتے ہیں۔

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے
کہ عکس آتشیں رطل گراں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر
زمیں کا ذرہ ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے

اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ
تبسم کارواں درکارواں معلوم ہوتا ہے
بحمداللہ کہ جوش اس صبح نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبل ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

صبح نو کی تازہ کاری میں ہندوستان کے روشن مستقبل کا اندازہ جوش نے کر لیا تھا۔ آخر یہی ہوا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ مگر یہ آزادی اس آزادی سے قطعاً مختلف تھی جس کے خواب جوش جیسے فنکاروں نے دیکھے تھے یہ آزادی تو غلامانہ ضمیر عطا کر گئی اور دماغوں میں ایسے فتور ابھار گئی جو ماؤں کو بیٹوں سے اور بہنوں کو بھائیوں سے جدا ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ دلوں کے تفرقے اتنے سخت و شدید تھے کہ ان کے سبب ہندوستان میں جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد، لڑائی جھگڑے ہوئے جن میں ہزاروں بے قصور عوام کی جانیں تلف ہوئیں جوش کی نظمیں ان واقعات کی جھلکیاں بھی اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے "ماتم آزادی" نظم لکھی جو پورے حالات کی واضح عکاسی کرتی ہے حالانکہ جوش "ترانہ آزادی وطن" لکھ چکے تھے مگر ملک کے جو حالات آزادی ملنے کے بعد سامنے آئے ان پر وہ "ماتم آزادی" لکھنے پر مجبور ہوئے۔ پنڈت نہرو سے جوش کے دوستانہ مراسم تھے انھیں کے ایما پر ۱۹۴۷ء میں جوش کو ماہنامہ "آجکل" کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس عہدے کے لئے جو انٹرویو ہوا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے جوش لکھتے ہیں۔

"جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار۔ پانچ آدمی ایسے موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا تھا اس کمرے میں بیٹھ کر میں نے اپنی پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو صورت سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے مجھ سے انگریزی میں کہا یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں.... میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں اور ڈبیا بٹوہ اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے یہ کہہ کر مجھ کو روک لیا کہ آپ

شوق سے پان کھائیں۔ اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں بس وہ نظم سنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی[1]
اس ہی انٹرویو کے بعد جوش آجکل کے ایڈیٹر ہوگئے اور پنڈت نہرو کی وجہ سے انھیں وظیفہ بھی ملنے لگا۔

۱۹۵۳ء میں "سرود و خروش" اور ۱۹۵۵ء میں "سموم و صبا" منظر عام پر آئے۔ جوش نے اردو زبان اور ہندوستان کو اپنی شاعری کے ذریعہ بیش بہا جواہر عطا کئے ان کی انھیں گراں مایہ خدمات کے لئے جوش کو ۱۹۵۴ء میں حکومت ہند نے سب سے بڑے قومی اعزاز پدم بھوشن سے نوازا۔ اس کے ایک برس بعد ہی اچانک جوش نے اپنے سفر کی باگ پاکستان کی طرف موڑ دی۔

جوش جیسے انقلاب پسند شاعر کے اس رویے پر عوام حیرت زدہ تھے۔ ظ انصاری نے لکھا۔

> "فرقہ پرستی، دو قومی نظریہ، پاکستان، فوجی آمریت، مذہبی احکام کی عملداری ان تمام مظاہر جن سے وہ ہمیشہ متنفر رہے تھے یہ سب انھیں کیسے قابل قبول ہو گئے صرف اس خیال سے کہ وہاں گھر والوں کی آسائش کے امکانات روشن ہیں تمام بڑے بڑے آدرش ان کا منھ تکتے رہ گئے؛ اور انھوں نے آموں کے بور، کوئل کی کوک، اور شام اودھ جہاں سے شاعری کے کھیت کی آبیاری ہوتی تھی بڑے درد کے ساتھ تج دیا۔"[2]

لیکن وطن عزیز سے ہجرت کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ تھی جو انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کی تھی کہ آزادی کے بعد انھیں ہندوستانی رہنماؤں سے قطعی سیکولرزم کی امیدیں تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ ان کی روح کی آواز جسے وہ اردو سے تعبیر کرتے انھیں کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ ہندو فرقہ وارانہ قوتیں اردو اور مسلم کشی سے باز نہیں آ رہی تھیں انھیں پاکستان میں امید کی رمق نظر آئی اور انھوں نے سامان سفر باندھ لیا۔ لیکن یہ سفر بھی انھیں راس نہ آسکا۔ جوش کو

---

[1] بحوالہ یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص۲۱۳

[2] بحوالہ "جوش، فراق اور گھر کا بندھن" الفاظ دو ماہی نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

پاکستان میں بڑی دشواریوں سے گزرنا پڑا ایک طرف فکر معاش تھی تو دوسری طرف ادبی گروہ بندیاں تھیں جن کے مابین پھر ان کا دم گھٹنے لگا۔ معاشی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ بیچ کر کام چلانے لگا۔"[1]

ان کا بڑا شاعر ہونا انھیں ان مصیبتوں سے نکالنے کا بھی سبب بنتا گیا پھر پاکستان میں "ترقی اردو بورڈ" وجود میں آیا اور جوش "مشیر ادب" کے عہدے پر فائز کیے گئے۔

۱۹۶۷ء میں جب جوش ہندوستان آئے تب اخبار والوں کو ایک انٹرویو میں جو باتیں کہدیں ان سے پاکستان کے حکمرانوں کے دل میں جوش کی قدر کم ہوگئی اور آخر انھیں نوکری سے بھی برطرف کر دیا گیا اس امر کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جس دن میری نوکری چھٹی تھی تو نوحہ، مرثیے کے بدلے میں نے اسی روز ایک نظم "تراد بہار" کے نام سے کہی تھی آپ بھی سن لیں اور داد دیں۔"[2]

اپنی آخری زندگی کا حال تحریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جان کی اماں پاؤں تو زبان بلاؤں اللہ اللہ
یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری
یہ پرانی یاروں کی کٹاریاں، یہ نئے ماحول کی آریاں
یہ مولد و منشاء سے دوری، یہ غریب کی رنجوری سینے
میں پھنکتی پھانسیں، یہ حالات کی اکھڑی سانسیں، یہ دل پر
چلتے بان، یہ سرسر کرتی کمان، یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں
یہ حکومت کی سرگرانیاں، یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی
بحران، اور یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ اور یہ دوش
پر عزت نفس کا جنازہ۔"[3]

---

[1] "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۲۲۲

[2] 〃 〃 〃 〃 ص ۲۲۹

[3] "یادوں کی برات" آئینہ ادب لکھنؤ ص ۲۳۵

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے دوران میں جوش کی زندگی کے دن زیادہ اچھے نہیں گزرے۔ وہ جو خواب لے کر ہندوستان سے پاکستان گئے تھے وہ وہاں شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔ ان کی وہ تمام خواہشات جو انھوں نے پاکستان سے وابستہ کر رکھی تھیں پوری نہ ہو سکیں۔ جوش فطرتاً جذباتی انسان تھے ان کے مزاج میں نزاکت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہندوستان میں انھیں جو مراعات اور اعزاز اور ہر دلعزیزی میسر تھی اس نے ان کی انفرادیت پسندی اور انانیت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ سرزمین پاکستان میں ان کی انفرادیت اور انانیت کو نہ صرف یہ کہ ابھرنے کے مواقع نہیں ملے بلکہ اس پر مسلسل ضربیں لگتی رہیں۔ جس کی وجہ سے جوش وہاں ذہنی طور پر غیر مطمئن رہے۔ اور چھوٹی چھوٹی پریشانیاں بھی وہاں ان کے لئے سوہانِ روح بنی رہیں جس کی وجہ سے وہ شدید بے چینی اور بے قراری کا شکار رہے۔ اور آخری عمر میں اس کا نتیجہ ایک خاموشی اور بے حسی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جوش کا جوش رخصت ہو گیا۔ ان کا بانکپن اور سرفروشانہ انداز دھیرے دھیرے مائل بہ زوال ہونے لگے۔ وہ ایک قسم کی مایوسی اور محرومی کا شکار ہو گئے اسی اثنا میں ان کی اہلیہ کی وفات ہو گئی۔ اس حادثہ نے ان پر اور بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ زندگی کی ساتھی رفیق اور غم گسار کی جدائی ان کے لئے غیر معمولی اذیت کا باعث ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی طویل عمر کی وجہ سے اعضا بھی اضمحلال کا شکار ہو گئے تھے۔ آخر کار ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اور ان کے ساتھ اردو شاعری کی ایک عظیم روایت، ایک پُر شکوہ دور اور زبان و بیان کے ایک منفرد انداز کے دبستان کا خاتمہ ہو گیا۔

# جوشؔ کے ادبی سرمائے کا تعارف

جوشؔ نے روایتی انداز میں غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ان کے گھر کا ماحول ان کی ادبی وراثت اور لکھنؤ کے اساتذہ کی ان کے گھر پر ہونے والی محفلوں سے ان کا غزل کی طرف مائل ہونا فطری امر تھا۔ ابتدا میں جوشؔ نے اس زمانہ کے مشہور شاعر عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح سخن لی یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی غزلوں میں عزیزؔ لکھنوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مگر یہ سلسلہ تلمذ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔

جوشؔ نے غزلیں اچھی کہی ہیں۔ روایت سے ہٹ کر انھوں نے نیا راستہ غزل میں نکالنے کی کوشش کی ہے اور ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ ان کی غزلیں پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں حسن وعشق کی حکایات پارینہ اور تاثر واحساس کچھ اس طرح بدلکر سامنے آئے ہیں جیسے وہ جدید رنگِ تغزل کی طرف جارہے ہیں۔ غزلوں میں جوشؔ نے صرف حسن وعشق کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور عشقیہ معاملات اور تجربات کو جوشؔ نے ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ شامل ہے۔ وہ اسیرِ حسن نہیں ہوتے بلکہ حقیقت حسن کا عرفان کراتے ہیں۔ اسی لئے وہ عشق کو بلند سمجھتے ہیں حسن وعشق کے معاملے میں جوشؔ نے روایات سے کام لیا ہے مگر نئے تجربات بھی کئے ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے اسی لئے غزلوں میں جوشؔ نے جن موضوعات کو اپنایا ہے۔ ان میں ایک جدت اور اپج پیدا ہوگئی ہے۔ ان سے تجربے کا خلوص اور مشاہدے کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

جوشؔ کی غزلوں میں ایک تسلسل ہے ایک نیا آہنگ ہے۔ وہ جذباتی حقیقت سے

غزل کی زبان تخلیق کرتے ہیں۔ اور تلخ حقائق کو مختصر لفظوں میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔ جذبے اور تخیل سے ان کی غزلوں میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی ہے جوشؔ نے اپنی غزلوں میں لفظوں کے استعمال، صحت الفاظ، تراکیب کی چستی اور بندش پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کی غزل گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غزلوں میں انھوں نے الفاظ کے استعمال سے بڑی گل کاریاں کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی غزلوں میں بڑی پرکاری نظر آتی ہے ..... غزل کو بعض نئے الفاظ کا ذخیرہ دیا ہے اور ایک نئی امیجری کی تشکیل کی ہے۔"[1]

جوشؔ نے اپنی غزلوں میں صرف داخلیت کو ہی جگہ نہیں دی ہے بلکہ خارجی رنگ کو بھی اپنایا ہے اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے زیادہ تر غزلیں خارجی انداز سے کہی ہیں تو بے جا نہ ہوگا مگر الفاظ کی جادوگری سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

---

جب سے مرنے کی جی میں ٹھانی ہے
کس قدر ہم کو شادمانی ہے

---

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمئ بازار نہ ہوتا

---

اٹھ باغباں خدارا گلشن میں نصب کر دے
ہلکی سی چاندنی میں پھولوں کا شامیانہ

---

[1] "جدید شاعری" از ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۰۳

باں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انکی غزلوں میں سرمستی اور والہانہ پن کی کیفیت تو ہے مگر داخلیت کا عنصر مفقود ہے مگر یہ سرمستی ہمیں داخلیت کے احساس سے بھلی معلوم دیتی ہے۔ ان اشعار کا تعلق حسن و عشق سے ہے لیکن یہ روایتی انداز سے قدرے مختلف انداز میں ہے۔ اس میں ہمیں حسن کے ساتھ ساتھ عشق کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور زندگی کو محترم رکھنے کی خواہش محسوس ہوتی ہے۔ غزل گو کے عام پھیپھا ذہن سے گریز کر کے وہ رجائیت کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ موضوعات بڑی حد تک غزل کے لحاظ سے نئے تھے جن سے یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ غزل کو ایک نئے معنیٰ دینا چاہتے تھے۔ وہ والہانہ پن جو حافظ کی یاد دلاتا ہے اور وہ پامردی کہ جو غالب کی شناخت تھی، جوش کی غزل میں خمیر کا کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین جوش کی غزل گوئی کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جوش کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں۔ محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں چونکہ وہ خود راہ محبت میں گم ہو چکے ہیں اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے۔"[1]

انھیں سب باتوں کی وجہ سے جوش صنف غزل میں مقبول ہوئے تھے جوش نے فارسی غزل سے استفادہ بھی کیا ہے جس کا انھیں احساس بھی تھا اسی لئے انھوں نے لکھا ہے۔

آج اے جوش تیرے رنگ غزل گوئی سے
قند پارس کا مزا ہے بزبان اردو

یہ صحیح بھی ہے کہ ا[illegible] قند پارس کا مزہ اردو زبان کو دیا ہے۔ کیونکہ ان کی غزلوں میں ایک ایسی کیفیت پا[illegible]ے جس کی وجہ سے پڑھنے والے پر ایک طرح سے وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہ[illegible] کیفیت اس لئے طاری ہوتی ہے کہ جوش نے غزل کے مزاج کو اس کی ہیئت سے [illegible]ـــ کر دیا ہے۔

---

[1] "تاریخ ادب اردو" از ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۱۸۲

صنفِ غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے اس میں نظم جیسی وسعت نہیں ہوتی اور جوش کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوتی تھی۔ غزل کی تنگ دامانی انھیں اس کے لئے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اپنے وسعت بیان کے لئے کوئی دوسری صنف تلاش کریں وہ غزل سے انحراف کرنا چاہتے تھے۔ مگر انحراف کرنے کا کوئی معقول جواز ان کے پاس نہیں تھا۔ ۱۹۱۲ء میں سلیم پانی پتی کا ان کے گھر قیام ہوا۔ سلیم پانی پتی حالی کے پیرو تھے انھوں نے جوش کو غزل کی تنگ دامانی سے نجات دلائی اور نظم کی طرف آنے کی دعوت دی اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر احتشام کو انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"سلیم صاحب نے غالباً ۱۹۱۴ء یا اس سے کچھ پیشتر غزل گوئی پر فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مجھے نظم گوئی پر آمادہ کیا۔"[1]

جوش کے نظم گوئی کی طرف مائل ہونے کے کئی اسباب میں سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ صنف غزل اختصار کا فن ہے اور اس میں کم و بیش جوش اپنے احساسات و تجربات کی ترجمانی نہیں کر پا رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حالی کی تحریکِ نظم کا اثر ہمہ گیر ہوا تھا جس کے اثرات لکھنؤ تک پہنچ گئے تھے اور شعرا میں نظم روز افزوں مقبول ہو رہی تھی۔ تیسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ لکھنؤ کی معاملہ بندی نے غزل کو بہت بدنام کر دیا تھا۔ غزل کے موضوعات کا سرمایہ محدود تھا۔ اس کی ہیئت مخصوص تھی۔ قافیے کا التزام جہاں اسے پھیلنے پھولنے کے مواقع سے محروم کر دیتا ہے وہاں ہر کس و ناکس کے لئے آسانیاں بھی مہیا کر دیتا ہے انھیں وجوہ سے جوش نے غزل کی طرف سے منہ موڑ لیا اور نظم گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جوش کی شاعری کے تقریباً پندرہ۱۵ مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں ان کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۹۲۱ء میں "روحِ ادب" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان کے موضوعات کا مرکز دل کی واردات میں۔ اس میں انھوں نے اپنی محبت کا اعتراف کیا ہے۔ عشق و عاشقی کے جذبات بیان کئے ہیں۔ اس زمانے کی نظموں میں داخلیت نمایاں ہے مگر اس داخلیت کا تعلق خصوصی طور پر دل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "روحِ ادب" کی نظمیں ہمیں ان کی محبت سے روشناس تو کراتی ہیں۔ مگر متاثر نہیں کرتیں۔ جذبات ان نظموں میں ہیں مگر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتے

---

[1] افکار جوش نمبر کراچی ص ۱۲۳

باوجود اس کے ان کا مجموعہ الفاظ کی جادوگری اور محبت کے پرخلوص اعتراف کی وجہ سے جوان دلوں کو محظوظ کرتا ہے "روحِ ادب" پر پہلا تبصرہ لکھتے ہوئے شرر لکھنوی رقم طراز ہیں۔

"کلام میں جو رنگینیاں، جو بلند ہونے والے سچے جذبات بے مثل استعاروں اور نازک تشبیہوں کے باریک پردوں میں چھپائے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب انسانی فطرت کو بلندیوں کی طرف ہدایت کرنے والے اور روحانیت میں جان ڈال دینے والے ہیں۔" [1]

"ایک نغمہ" میں جوش کہتے ہیں

میرے قلب کو زندگی دو جلاؤ — حقیقت کی محفل سے پردہ اٹھاؤ
میں قطرہ ہوں مجھ کو سمندر بناؤ — کچھ اس طرح تا دیر نغمے سناؤ

یونہی پیاری چڑیوں ابھی اور گاؤ

"ہماری سیر" میں زندگی کی تلخ حقیقت کا اشارا کرتے ہوئے اپنے غم کا یوں احساس کراتے ہیں۔

گھر پلٹتے ہیں وہ "ہوا" کھا کر
اور ہم زخم کھا کے آتے ہیں

"روحِ ادب" کی ان کی نظموں میں ہمیں ایک لاابالی جوان عاشق کی صبح و شام میں نظر آتی ہیں اسے دنیا سے کوئی مطلب نہیں وہ اپنی دنیا میں گم ہے۔ اور حسن و عشق کے چکر میں پڑا ہوا ہے ان کی نظم "حالاتِ حاضرہ" سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اب جوش دنیاوی مسائل کی طرف بھی متوجہ ہو گئے ہیں کیونکہ "حالاتِ حاضرہ" میں پہلی جنگ عظیم اور اسی کے ساتھ خدا کے قہر کا بھی سرسری طور پر بیان ہے اس طرح ان کی نظموں "گریۂ مسرت" اور "حقیقتِ دل" میں بھی ان کے بدلے ہوئے احساس کی روانی صاف طور سے محسوس ہوتی ہے۔ روحِ ادب کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں نادر تشبیہات و استعارت کا استعمال اور جذبے کی شدت کا بہترین اظہار کیا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

---

[1] "پہلا تبصرہ" افکار جوش نمبر کراچی ص ۲۰۲

تم سے اظہارِ خیالات کریں یا مر جائیں
آج اس بات کا ہم عہد کئے بیٹھے ہیں

---

ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن
کتنوں کو اس جنون نے بیکار کر دیا

---

کیا نزع کی تکلیفوں میں مزہ جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہوا

---

"روحِ ادب" کی مقبولیت کے بعد ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "نقش و نگار" ۱۹۳۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ "نقش و نگار" نے اردو شاعری کی دنیا میں دھوم مچادی۔ اس کی نظمیں "کون اٹھا ہے شرماتا"، "کوہستانِ دکن کی عورت"، "گنگا گھاٹ پر"، "جنگل کی شہزادی"، "جوانی کی رات"، "آج کی رات" وغیرہ نے جوشؔ کو رومانوی دنیا میں بڑا مقبول و مشہور کر دیا۔ "نقش و نگار" میں جہاں انھوں نے محبت کی کیفیتوں کا بیان کیا ہے حسن کی دل آویز تصویر کشی کی ہے وہیں "چند جرعے" جیسی مدہوش نظم لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ

فرش کیا عرش کو بھی پست کر دوں
خودی کیسی خدا کو مست کر دوں

"کوہستانِ دکن کی عورتیں" میں انھوں نے مزدور عورتوں کے جوان جسم کا حسن پرستانہ تجزیہ کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

یہ اُبلتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں یا کہ برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفانِ خیز تر بلا شباب

پوری نظم تاثراتی کیفیت لئے ہوئے۔ اسی طرح جنگل کی شہزادی" میں وہ اجمیر سے چتوڑ ریل سے سفر کرتے ہوئے جا رہے ہیں اور موسم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تھیں رخصتِ کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

تو وہاں انھوں نے ایک حسینہ کو میدان میں کھڑا ہوا دیکھا اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں۔

زاہد فریب، گل رخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر
غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں
حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑیوں میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں
حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

"گنگا کے گھاٹ" نظم میں بھی وہ ایک عورت کو نہا کر آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پوچھتے ہیں

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے

حسن کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ داد دیئے بغیر دل نہیں رک سکتا وہ کہتے ہیں۔

دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مد
نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ
ہوائے صبح سے روشن چراغِ سیم تنی
شگفتہ فصلِ سحر سے مزاجِ گل بدنی

اور آخر میں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

"یہ کون اٹھا ہے شرماتا" میں بھی خواب ناز سے بیدار ہونے والی حسینہ کی بڑی دل کش تصویر کشی کی ہے۔ ان کی نظم "جوانی کی رات" بھی کیفیاتی نوعیت کی نہایت خوبصورت نظم ہے وہ کہتے ہیں۔

شب، کہ حریم ناز میں شور صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا

خشک تکلفات کی حدیں ٹوٹ چکی تھیں نیاز و ناز میں معرکہ عظیم در پیش تھا عشق کی نبضوں میں تیز بجلیاں دوڑ رہی تھیں تو حسن کے دست ناز میں رباب شعلہ فشانی کر رہا تھا اور

گنبد قصر عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی، جوشش تر اشباب تھا

کہہ کر وہ اس نظم کو ختم کرتے ہیں مگر پڑھنے والے کیف و مستی میں گم رہ جاتے ہیں۔ اسی مجموعہ میں جوشؔ کی وہ نظم بھی شامل ہے جو انھوں نے حیدر آباد جاتے ہوئے ملیح آباد سے رخصت کے وقت کہی تھی ملیح آباد کا ذرہ ذرہ انھیں حسرت سے دیکھ رہا ہے اور جدائی کا یہ کرب ہر شے پر طاری نظر آنے لگتا ہے "الوداع" میں وہ صرف ملیح آباد کے چھٹ جانے کا ہی ماتم نہیں کرتے بلکہ وہ ملازمت کے لئے جانے پر اپنی خاندانی امارت کو مجروح دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔

چھٹ رہا ہے ہاتھ سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزتِ دیرینۂ اجداد کا
موجِ کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے
خواجگی رخت سفر باندھے غلامی کے لئے

اور اس تمنا کے ساتھ اس نظم کو پورا کیا کہ

حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

"نقش و نگار" میں ہی انھوں نے اپنی نظم "پروگرام" میں اپنے شب و روز کا بھی تعارف دیا ہے کہتے ہیں۔

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈھنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفان میں ملے گا

صبح کو ناظرِ نظارۂ قدرت چمن صحن بیاباں میں۔ دن کو سرگشتۂ اسرارِ معانی شہرِ ہنر کوئے ادیباں میں اور شام کو وہ رندِ خرابات بادہ فروشاں میں اور رات کو خلوتی کاکل و رخسار بزمِ طرب کوچہ خوباں میں اور اگر حالات جبر کا سامنا ہو گیا تو پھر وہ بندہ مجبور خانہ ویراں میں ملے گا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہی ان کا ایک اور مجموعہ کلام "شعلہ و شبنم" شائع ہوا۔ شعلہ و شبنم میں وہ نظمیں شامل ہیں جو تاریخی حیثیت بنا چکی ہیں ان نظموں نے دنیائے ادب میں اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ "ذاکر سے خطاب" میں ذکرِ حسین کرنے والے اس شخص کو ہدفِ ملامت بنایا ہے جو مذہبی عقیدے کی آڑ میں لوگوں سے پیسہ بٹورتا ہے اور مذہب کے نام پر اپنی کمائی کرتا ہے مذہبی کٹھ ملاؤں کی حقیقت کو جس طرح اس نظم میں بے نقاب کیا گیا ہے اس کا اثر پڑنا لازمی تھا وہ ذاکر سے کہتے ہیں۔

تو نہیں روحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند
تیرے شانوں پر تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند
سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند
پیروئے ضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند
ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ وفا کے واسطے
یوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

حضرت امام حسین کی شہادتِ عظمیٰ کی غرض و غایت بیان کر کے وہ احساس دلاتے ہیں کہ۔

ختم ہے آنسو بہانے پر ہی تیری آرزو
اور شہیدِ کربلا نے تو بہایا تھا لہو

آگے چل کر وہ باطل کی حکومت کے خلاف بغاوت کے لئے لوگوں کو ابھارنے کی تلقین کرتے ہوئے اس حکومت کو حرام قرار دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس وقت حالت یہ ہے کہ

تیری غیرت کو خبر بھی ہے کہ دشمن کا عتاب
تیری ماں بہنوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب

اب تو زخمی شیر کی صورت بپھرنا چاہیئے
یہ اگر ہمت نہیں تو ڈوب مرنا چاہیئے

یہ نظم پورے ملک میں بے پناہ مقبول ہوئی عام لوگوں میں شہادت کا اصل جذبہ کیا تھا یہ پیغام واضح شکل میں پہنچ جانے سے فکر و عمل کی بہت سی نئی راہیں کھلیں اسی طرح نظم "شاعر ہندوستان" میں اہل فن کی ناقدری کا ماتم کیا اور کہا کہ

جہل کا دریا ہے اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعر ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

ایک اور نظم "شریکِ زندگی سے خطاب" میں جوشؔ نے اپنی شریک حیات کو احساس دلایا کہ تو صرف میری بادہ نوشی کو دیکھ کر ہی پریشان کیوں ہوتی ہے ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کا بھی ماتم کر جہاں ہر جگہ تخریب کا بازار گرم ہے غلامی کے سبب ہماری تہذیب ہمارا تمدن سب کچھ تباہ و برباد ہو رہا ہے اس مجموعے میں "شکست زنداں کا خواب" "کسان" وغیرہ کو بھی اردو شاعری کے اوراق زریں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ "شکستِ زنداں کے خواب" میں انھوں نے تحریک آزادی وطن پہ اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب آزادی کو حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔ اب عوام کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن ہو گئی ہے زنداں کی حالت کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں چمکتی شمشیریں

اور اس کے بعد وہ عوام کے غم و غصے کا اظہار نہایت چابکدستی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

اپنے بیٹے کے نام ایک نظم "سجاد سے" میں جوشؔ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہیں کہ میرے بعد دنیا والے اور تمام عزیز و اقربا تجھے پریشان کریں گے تو اس وقت بھی جب کہ تو تنہا رہے گا ہمت سے کام لے کر تلوار اور قلم کا سپاہی بن کر زندگی بسر کرنا۔ اپنی زندگی وطن عزیز

کو آزاد کرانے کے لئے قربان کر دینے سے بھی دریغ مت کرنا۔ اپنے باپ کی روح کو خوش کرنے کے لئے اگر تو وطن کے لئے سر بھی کٹائے گا تو کوئی بات نہیں اور اگر تو برائے فاتحہ اپنے باپ کی قبر پر آئے تو اس وقت بھی کاش کہ تو ایسے پھول لے کر آئے

باغ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدہ آزادیٔ ہندوستاں کے پھول ہوں

"شعلہ و شبنم" میں "زنداں کا گیت"، "زبوں دگی"، "روحِ شام"، "پیا بن ناگن کالی رات"، "آواز کی سیڑھیاں"، "فاختہ کی آواز"، "بدلی کا چاند"، "گریۂ مسرت" جیسی روح پرور نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کی غزلیں بھی جدید رنگِ تغزل لئے ہوئے کافی تعداد میں شامل ہیں۔

جوشؔ کا چوتھا مجموعہ "فکر و نشاط" ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر آیا اس میں ان کی وہ مشہور نظم "نقاد" بھی شامل ہے جس نے بزعمِ خود غلط قسم کے نقادوں کو للکارا ہے اور شعر فہمی کے لئے جو شعور، وجدان اور معیار ضروری ہے اس کا احساس دلایا ہے۔ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی فن پارے کو پیش کرتے وقت فن کار کے دل پر کیا کچھ گزرتی ہے اور وہ اس کے اظہار کے لئے زبان و بیان کی کس کشمکش سے الجھتے ہوئے اصل مدعا بیان کر پاتا ہے وہ کہتے ہیں۔

طورِ معنیٰ پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو
یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے شاعر کی دنیا اور ہے

جوشؔ بحیثیت شاعر اس دور میں اپنے آپ کو "شمعِ فروزاں" سے تشبیہ دیتے ہیں ان کی اس نظم کا آغاز یوں ہوا ہے۔

میں اے جوشؔ اس دور میں ہوں وہ شاعر
اندھیرے میں جس طرح شمعِ فروزاں

کیونکہ ان کے دل میں فکر کرتے وقت جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ بالآخر بنی نوعِ انسان کی امیدوں کی آبیاری کرتی ہے۔ ان کے اندر آزادی کی شمعیں روشن کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

دم فکر دل میں چھپاتی ہیں دھومیں
تمنائے بیداریٔ نوعِ انساں

ایک اور نظم "ہم لوگ" میں بھی وہ اپنے مقام کا تعین کرتے ہوئے اپنی ذات کا تعارف اس طرح دلاتے ہیں۔

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

زمین و آسماں، حیات و موت، جبر و اختیار، سب پر اپنی بالادستی قائم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

بجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہر چند
مگر پیمبرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ
ادب سے آؤ ہمارے حضور اہل نظر
جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ
نگاہ روبرو، اے روحِ نعمت دار بن
بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

اس مجموعے میں "شاعر کا دل"، "خطِ رفتار"، "بلوغِ حیات"، "سعی لاحاصل"، "انکشافِ فطرت"، "خونی بینڈ"، "مولوی" وغیرہ کامیاب ترین نظمیں ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جوش کی رباعیات کا ایک مجموعہ "جنون و حکمت" شائع ہوا جس میں بڑی نادر اور خوبصورت، رنگین و بصیرت افروز رباعیات شامل ہیں۔ ان رباعیوں میں شاعر کی روح کی کشمکش، حقائق کی تلاش و اظہار، جبر و قدر، آزادیٔ عمل کی خواہش، مے نوشی کا ذکر سبھی کچھ ملتا ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن کا نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

---

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا وار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کی روایات کا بار

---

اب خواہش لذات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی
ور کس لئے گھٹ گھٹا رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

---

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

---

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب
سو بار جہنم میں جلانا یا رب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

جوش کی رباعیوں نے اردو میں صنف رباعی کو بھی ایک نئی اور لازوال زندگی عطا کی یہاں بھی زبان و بیان پر ان کی قدرت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے رباعی کی ہیئت میں نت نئی تشبیہات اور نادر استعارات و تراکیب کا استعمال کیا موضوعات میں اخلاق، شباب اور شراب کا درجہ بلند ہے ان کے اظہار میں شکوہ اور طنطنہ ہے بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ خمروزر کے اظہار میں ان کا اسلوب عمر خیام کی یاد دلاتا ہے۔
۱۹۳۳ء میں جوش کا مجموعہ حرف و حکایت شائع ہوا اس مجموعے کی ایک نظم

سنگ تبسم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ ہر لحظہ ہے یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی
حقیقت کیا سمجھ میں آ سکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی
صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی
اُدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اور اس نظم میں کائنات کی تمام کیفیت بیان کرتے ہوئے آخر میں جوشؔ اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظِؔ و خیامؔ ہے ساقی

اسی مجموعے میں ان کی وہ مشہور نظم "فتنۂ خانقاہ" بھی شامل ہے جس نے اس دور میں بڑا تہلکہ مچایا تھا منظر کشی کا ایک نادر نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

اک دن جو بہرِ فاتحہ ایک بنتِ مہر و ماہ
پہونچی نظر جھکاتے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں پہ دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا

اور خانقاہ میں ہر طرف الاماں کی آوازیں آنے لگیں شیوخ کی داڑھیاں ہل گئیں اس نے جوشؔ اس کافر ادا کے حسن کی تعریف کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

ہاتھ اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے

جا دو نگہ پڑا نگہِ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
ایک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

اس نظم کا اختتام وہ ایمان کو عشق کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جانے کی اس کیفیت پر کرتے ہیں :-

زاہد حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

اس مجموعے میں "بہت بڑا بدکار"، "غلط بخشی"، "شعر کی آگ"، "نوحۂ فراق"، "امروز بے فردا" جیسی نظمیں شامل ہیں۔ "بہت بڑا بدکار" میں جوشؔ یہ بتاتے ہیں کہ پیٹ کی خاطر آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ وہ طرح طرح کے خطرات مول لیتا ہے ذلیل سے ذلیل کام کرنے سے نہیں چوکتا۔ "غلط بخشی" میں خدا سے شکوہ کیا ہے کہ اس نے یہ کیا نظام قائم کر دیا ہے کہ عالموں پر جاہل حکومت کرتے ہیں۔

جھکے خاک پر علم کی بارگاہ
جبینِ جہالت پہ کج ہو کلاہ

"شعر کی آگ" میں اپنے اشعار کی گرمی سے عوام کے دلوں جو حرارت پیدا ہوتی اس کی بہترین عکاسی کی ہے "نوحۂ فراق" میں اپنی محبوبہ کی جدائی کی داستان سنائی ہے "امروز بے فردا" میں بھی فراق کی کیفیت اور دل کی اداسی پیش کی ہے۔

جوشؔ کا مجموعہ "آیات و نغمات" ۱۹۴۱ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں موسوم بہ عنوان "مہاجن" نظم میں جوشؔ نے ہندوستانی سرمایہ دار مہاجن کے سراپے کو بیان کیا ہے یہ نظم اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب ہمارے دیہاتوں میں مہاجنوں کا

زور تھا اور لوگ مہاجنوں سے قرضہ لے کر پیڑھی در پیڑھی کے مقروض بن جاتے ہیں یہ مہاجن غریب کسانوں سے میٹھے بول کر سادہ دستاویزوں پر انگوٹھا لگوا کر انھیں ہمیشہ کے لئے اپنا قرض دار بنا لیتے تھے مہاجن کا سراپا دیکھئے۔

دانت پیلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گوشے پیٹ میں توندی کا غار
خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلاتے، توند سہلاتا ہوا
کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے

ایک اور نظم "خالی بوتل" میں راستے میں پڑی ہوئی ایک خالی بوتل کی تعظیم کرتے ہوئے اسے سلام کیا ہے کیونکہ جب اس میں مے بھری تھی تب اس کی قدر کی جاتی تھی لیکن خالی ہو جانے پر یوں پھینک دیا جانا انھیں ناگوار ہوتا ہے۔ اس مجموعے کی مقبول نظموں میں "باغی روحوں کا کورس" "تنہا" "پیلا دة" "ریل کی پٹریاں"۔ "زاہد ہزار شیوہ"۔ اور "روپ متی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی تین نظمیں "تو اگر واپس نہ آتی" "فاتح بحر کی خدمت میں" اور "نیا امرت"۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں جس کی تفصیل جوش نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" میں درج کی ہے ان کی ایک محبوبہ نے بمبئی کے ساحل اپالو میں خودکشی کی غرض سے چھلانگ لگا دی تھی اور اس کو بچانے کے لئے جوش خود اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اسے نکال لائے تھے۔ "تو اگر واپس نہ آتی" میں وہ کہتے ہیں۔

تو اگر واپس نہ آتی بحر ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا زمیں جلتی ستارے کانپتے
لیکن اس لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات

"آیات و نغمات" کے بعد ۱۹۴۳ء میں جوش کا مجموعہ "عرش و فرش" شائع ہوا اس مجموعے

کی نظم "کارل مارکس" پڑھ کر جوش کا اشتراکی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے ویسے اس سے پہلے بھی ان کی نظموں میں اشتراکیت کے مضامین ملتے ہیں مگر اس نظم میں تو کارل مارکس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ ڈالتے ہیں۔

مانتیں قومیں اگر تیرا انتظام　　آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام

اس مجموعے کی دوسری اہم نظم "آدمی نامہ" ہے جو نظیر اکبر آبادی کے "آدمی نامہ" کے بعد اپنی نوعیت کی ایک بے مثال نظم ہے اس میں جوش آدمی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں

انسان وہ کلی ہے جو اب تک کھلی نہیں
وہ شاخ ہے ہوا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے یہ وہ کہ جو اب تک سلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اس کو ملی نہیں

جو آج تک ہے بند وہ تالا ہے آدمی

پھر بھی آدمی ہمت سے آگے کی سمت رواں دواں مسفر در رہا ہے جوش نے بھی اپنی اس نظم میں آدمی کو ایک دن منزل مقصود تک پہنچ جانے کا یقین دلایا ہے اور اس اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ انسان تمام پریشانیوں کے باوجود ایک نہ ایک دن فتح مند ہو کر رہے گا۔ اس مجموعے کی مشہور نظموں میں "ارباب ادب ہوشیار" "اترا ہوا چہرہ"۔ "سونی جنت" "نظام نو" "نامکمل خاکے" قابل ذکر ہیں ان کی نظم "کارل مارکس" بھی اسی مجموعے میں شامل ہے اس کے علاوہ رباعیات بھی ہیں یہ مجموعہ بھی کافی مقبول رہا ہے۔

۱۹۴۵ء میں "رامش و رنگ" شائع ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی تحریک آزادی زوروں پر تھی اور عوام کے دلوں میں آزادی کی لہر دوڑ چکی تھی اس مجموعے کی ایک نظم "اٹھو اے ندیم" نے کافی شہرت حاصل کی جس میں جوش نے لکھا تھا۔

اٹھو اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں۔ آسماں بدل ڈالیں
یہ ولولہ ہے تو آ، سب سے پیشتر اے دوست
مزاجِ طفلکِ ہندوستاں بدل ڈالیں

اس مجموعے میں "اپنی ملکہ سے" "برسات کا پچھلا پہر" جیسی بے مثال کافی نظمیں اور

ان کی طویل ترین نظم "حرفِ آخر" کا ایک حصہ بھی شامل ہے اس کے علاوہ رباعیات اور کچھ فلمی گیت بھی اس مجموعے کی زینت ہیں جو معیار کے لحاظ سے مذکورہ نظموں سے کم تر ہی قرار دیئے جائیں گے ایک مشہور گیت کا بند ملاحظہ ہو۔

نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
چہکار سے چڑیوں کی چمن گونج رہا ہے۔۔
جھرنوں کے مدھر راگ سے بن گونج رہا ہے
پر میرا تو فریاد سے من گونج رہا ہے
کب تک مرے ہونٹوں پہ یہ فریاد رہے گی
نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

"حرفِ آخر" میں نے تخلیق سے پیشتر عنوان سے جو اقتباس یا پہلا حصہ اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے اس میں سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب اور پھر عدم سے وجود کی جانب بڑھنا اور خدا کی آواز گونجتی ہے۔

اے مرے تخیل بن جا کائناتِ ہست و بود
ہاں پہن اے جذبۂ ایجاد تشریفِ وجود
اے عدم اٹھ گامزن ہو شکلِ موجودات میں
اے مرے اجمال آ جا رنگِ تفصیلات میں

اس طرح ابتدائے آفرینش سے انسان کی تخلیق اور اس پر فرشتوں کا اعتراض کرنا پھر خدا کا ان کو جواب دینا اور یہ بتانا کہ۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسانیت تابندگی

اور یہ کہ انسان کی مکمل تعریف خدا خود کرتا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

کون انساں، فاتحِ کونین، امیرِ آب و گل
سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل
آسماں کا داور و دارا زمیں کا کج کلاہ
بر کا آقا، بحر کا مولیٰ، فضا کا بادشاہ،

چشمِ ہستی کی بصارت ، زندگی کا رازداں
خامشی کا زمزمہ ، گونگے حقائق کی زباں

یہ ڈرامائی انداز کی طویل نظم جوش کی ایک تابناک تخلیق کا درجہ حاصل کرے گی ایسا اندازہ اس کے ابتدائی حصے کو پڑھ کر ہی ہونے لگا تھا۔

۱۹۴۳ء میں جوش کا مجموعہ "سنبل و سلاسل" شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں "لیلائے آزادی" "مستقبل ہندوستان" "اے جانِ من" اور "رفیقۂ حیات" ایسی نظمیں شامل ہیں جو اس مجموعے کی مقبولیت کا خاص سبب قرار دی جاسکتی ہیں۔ "مستقبل ہندوستان" ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی اور یہ زمانہ شدید جذبہ آزادی کا زمانہ تھا اس وقت مکمل آزادی کے لئے جد و جہد جاری تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب ملک آزاد ہو کر رہے گا۔ اس نظم میں حالات کا یہ رخ پیش کیا گیا ہے۔ "رفیقۂ حیات" میں اپنی بیوی سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تو ہے ضامن میرے ہر آغاز ہر انجام کی
تجھ پہ ہے بنیاد میری نسل میرے نام کی

اس نظم میں جوش اپنی شریکِ حیات کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں اب تجھ سے محبت نہیں کرتا ہوں کیونکہ مجھے تیری وفائیں یاد ہیں۔ تو نے میرے رومانوں کی خاطر کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور تو ہمیشہ ثابت قدم رہی ہے اب جس طرح تو جوانی کی عمر ختم کر چکی ہے اسی طرح میں بھی اب جوان نہیں ہوں مگر میرے دل میں بچپن کبھی اس طرح ابھر آتا ہے کہ میں شرارت کر بیٹھتا ہوں میرے دل میں تیری جوانی اور دلہن بن کر آنے کے تمام واقعات تازہ ہیں تو اپنے بالوں کی سفیدی سے پریشان مت ہو کل کی طرح آج بھی تیرا دلدادہ ہوں پوری نظم تاثراتی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل رباعیات بھی جوش کے فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایک رباعی دیکھئے۔

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنیٰ
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

۱۹۴۷ء میں ہی جوشؔ کا ایک اور مجموعہ "سیف و سبو" شائع ہوا۔ اس مجموعے میں "ہنوز، شام کارواں، تعاقب، برسات کی چاندنی" وغیرہ نظمیں شامل ہیں جو اس مجموعے کی بہترین نظمیں کہی جاتی ہیں۔ "شام کارواں" میں ان کی کیفیت دیکھئے۔

شفق کو دیکھتے ہی، وہ محبت جس کو جگ بیتا
میرے دکھتے ہوئے دل میں جوان معلوم ہوتی ہے

برسات کی چاندنی میں لکھتے ہیں چاندنی تالاب سناٹا پپیہے کی صدا سے چاند ایسا لگتا تھا۔

لرزش صہبا میں جھلکے جس طرح نشے کی روح
چاند ہے اس طرح قلب آب میں ڈوبا ہوا

اس طرح "تعاقب" میں ماضی کی یادیں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور یہ آوازیں ان کو آتی رہتی ہیں۔

مرد ہو عشق سے جہاد کرو  اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو

اس مجموعے میں شامل جوشؔ کی رباعیات ان کی رومانوی فطرت کی بہترین عکاسی کرتی ہیں ۱۹۵۵ء میں "سرود و خروش" شائع ہوا ہندوستان کی آزادی کے بعد ان کا یہ مجموعہ کافی اہمیت کا حامل رہا ہے اس میں ان کی تقریباً ۱۵ نظمیں اور کچھ رباعیات شامل ہیں اس مجموعے میں جہاں "ترانۂ آزادیٔ وطن" جیسی استقبالیہ نظم ہے وہیں اس میں ان کی "ماتمِ آزادی" بھی شامل ہے جس میں جوشؔ نے عوام کے اس خواب کو جو انھوں نے آزادی سے قبل دیکھا تھا چکنا چور ہوتا پایا ہے آزادی کے بعد تحفے میں خون کی ہولیاں لٹنے اور اندھیرا ہی اندھیرا چاروں طرف پھیل جانے کا ماتم کیا ہے وہ اپنائے وطن کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

سکھ نے گرو کے نام کو بٹہ لگا دیا
مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا
مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

ایک سوئے ظن کو فلسفۂ عام کر دیا
مریم کو خود مسیح نے بد نام کر دیا
سکوں کے انجمن میں خریدار آ گئے
سیٹھوں کے خادمانِ وفادار آ گئے
کھدر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے
تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیر زمیں گئے

وہ ملک کی بدلی حالت کی ایک ایک چیز کا ماتم کرتے ہیں درج ذیل بند ان کی شدت جذبات اور گہرے کرب کا مظہر ہے۔

سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ برگ و بار
مجنوں نہ جام جم، نہ جوانی نہ جوئے بار
گلشن نہ گل بدن، نہ گلابی نہ گل عذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

"درسِ آدمیت" میں وہ انسان کو انسان بننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ انساں بنو گے تو گل جاؤ گے — خود اپنے جہنم میں جل جاؤ گے

"پند نامہ" میں جوش نے شراب پینے کے آداب مجاز کو سکھائے ہیں اور کثرت مے نوشی کی خرابیاں بیان کی ہیں وہ کہتے ہیں۔

عقل کی موت علم کی پستی — الاماں لعنتِ سیہ مستی
الٹ گھٹ ٹوپ نشے کا طوفاں — گلوت عفریت، دیو، جن، شیطاں

پھر وہ مجاز کو عصرِ حاضر کا شاعر خود دار قرار دیتے ہوئے اسے خدمت خلق کے لئے اس طرح آمادہ کرتے ہیں کہ دوستی اور زندگی کا تجھ پر کچھ قرض ہے جسے تو اپنی شاعری کے ذریعہ اتار کر جا تا دم کھتے ہیں۔

ذہن انسانیت ابھار کے جا ۔۔۔ زندگانی کا قرض اتار کے جا

اور دعا دیتے ہیں کہ۔

تجھ پہ ہندوستان ناز کرے ۔۔۔ عمر تیری خدا دراز کرے

"سرود و خروش" میں ان کی وہ نظم "مناجات" بھی شامل ہے جس میں انھوں نے خدا سے یقین کی صورت میں سامنے آنے کو کہا ہے مناجات کے آخری شعر یوں ہیں۔

یقین بن کے جب تک نہ آئے گا تو ۔۔۔ تو اے وہم دیرینۂ ابلہ ہوُ

رہ کفر کی خاک چھانے گا جوش

نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوش

"استقلال" "میکدہ"، "کھو کھلے دعوے" وغیرہ بھی ان کی مقبول نظمیں رہی ہیں۔

۱۹۵۲ء میں جوش کا مجموعہ "سموم و صبا" منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ بھی ان کے اہم ترین مجموعوں میں شامل ہے۔ اس میں بھی تقریباً ۹۰ نظمیں شامل ہیں اور تقریباً دو سو چالیس رباعیات بھی اس مجموعے کی زینت ہیں۔ ان نظموں میں "دعوت انقلاب"، "رشوت"، "کلکتہ"، "کیا کروں"، "ذہنی رفتار"، "اعتراف عجز"، "کینک"، "کچوکا"، "زم زم"، "جنگل میں منگل"، "نمبر سے بعد"، "یاد کرو"، "بے چارگی"، "نغمہ سحری"، "نشاطروں کو سلام"، "قیدیوں کا حملہ" اور سب سے زیادہ پرتاثیر نظم "السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام" (جس میں مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے) شامل ہیں یہ نظمیں ملک میں کافی مشہور و مقبول ہوئی ہیں۔ جوش مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تو ہی ایک دانائے کامل بزم نادانی میں تھا

روشنی کا تو مینارہ بحر طغیانی میں تھا

تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا

نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا

اے غرور ہند اور فخر مسلماں السلام

السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

اس مجموعے میں شامل ان کی رباعیات بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں

ابن آدم کو صاحب جاہ کرو ۔۔۔ کم بخت کو اور نہ گمراہ کرو

اللہ سے انسان ہے کب کا آگاہ ۔۔۔ انسان سے انسان کو آگاہ کرو

اس قسم کے خیالات ان کی نظموں میں عام ہیں۔ اوہام عقائد۔ اعتراف عجز وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ "سموم وصبا" کی نظموں میں قاری کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ کلکتہ کا سفر جوش کا ذاتی سفر ہی سہی مگر ان کی یہ نظم ہر پڑھنے والے کو اپنا تجربہ معلوم ہوتی ہے۔ "رشوت" کی گرم بازاری آج بھی وہی ہے اس لئے ان کی یہ نظم آج بھی اتنی ہی بامعنیٰ ہے جتنی اس زمانہ میں تھی۔ ان کی اکثر نظمیں آج کے ماحول پر بھی پوری اترتی ہیں اور بے وقت کا راگ معلوم نہیں ہوتی ہیں یہی ان کی مقبولیت کا سبب ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایک طویل نظم "طلوع فکر" اور ایک مسدس "موجد و مفکر" اور رباعیات کا ایک مجموعہ "قطرہ و قلزم" بھی شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

"طلوع فکر" کا ایک بند دیکھئے۔

جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب
کانپے نجوم زرد ہوا روئے ماہتاب
کھنکے فلک کے جام کھلے سرخیوں کے باب
اڑنے لگا عبیر برسنے لگی شراب
رنگوں کے آب و تاب چرانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

۱۹۷۱ء میں ان کا مجموعہ "الہام و افکار" شائع ہوا یہ مجموعہ ان کی پختگی عمر کی یادگار نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کی تقریباً تمام نظمیں جوش کی قادر الکلامی اور زبان و بیان کا بہترین نمونہ ہیں۔ البتہ ان میں جوش اور رنگینی کم ہوتی ہے ان کی محبوبہ کی چمک دمک بھی اب ستو لاگئی ہے زندگی اور اس کے مسائل ان نظموں کے رگ و پے میں موجزن ہیں۔ افکار و خیالات میں بھی عمق اور سنجیدگی ہے وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتے ہیں "میرے اجزائے فکر" میں جوش نے اپنے فکر کے تسلسل کا ذکر کرتے ہوئے اپنی افتاد طبع پر اچھی روشنی ڈالی ہے وہ کہتے ہیں۔

طبع رسا کی زلف دوتا میں گندھا ہوا
میرا تسلسل ادب خانداں بھی ہیں
کچھ میرزائیاں بھی ہیں طرز سخن کے ساتھ
اور کچھ ستیزہ کاری افغانیاں بھی ہیں

اس مجموعے کی ایک نظم "عروجِ انسانی" میں جوشؔ نے انسانی شعور کے عروج کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اب انسانی شعور جاگنے والا ہے اور زندگی ایک نیا موڑ لینے والی ہے اب وہ دن دور نہیں جب انسان اپنی عظمت کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے وہ یہ نعرہ لگا سکے گا۔

عجب نہیں کہ سرِ بزمِ وحدتِ مطلق
زبانِ حق پہ ہو اب نعرہ انا المنصور

اپنی ایک اور طویل نظم "اے نوعِ بشر جاگ" میں انسان کو قوم اور ملک کے دائروں سے نکل کر انسان کامل بننے کی تلقین کرتے ہوئے جوشؔ کہتے ہیں۔

تو جنسِ تعصب کا خریدار ہے اب تک
ملکوں کے گھروندوں میں گرفتار ہے اب تک
تو شرک و خونخوار و سیہ کار ہے اب تک
انسان کے اے دیدۂ توحید نگر جاگ
اے نوعِ بشر جاگ۔ اے نوعِ بشر جاگ

اس مجموعے کی نظموں میں "آدمی نامہ"۔ "وحدتِ انسانی"۔ "زندگی"۔ "لافانی حرف"۔ "موجد و منکر"۔ "انا"۔ "زندگی اور موت" جوشؔ کی عمیق فکر اور بہترین فنکاری کی چند اچھی مثالیں ہیں۔ آدمی نامہ میں جوشؔ نے آدمی کے مختلف روپ کی مثالیں دے کر اس کی لافانی حیثیت بتاتی ہے اور اس کی قدر کرنے کی ہدایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ابتدائے آدمی پیغمبری　　انتہائے آدمی ہے داوری
اور شہر و صدر کر اے آدمی　　آدمی کی قدر کر اے آدمی

نظم "زندگی" میں زندگی کو تابندہ و پائندہ بتانے کی کوشش کی ہے اور الفاظ کے تواتر و تکرار سے ایک نغمگی پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جام بجام بر بسر خانہ بخانہ در بدر
خیر بخیر شر بشر سر بسر نہاں ہے زندگی

طویل ترین نظم "انا اور زندگی و موت" میں تینوں کا تجزیہ بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے اردو شاعری میں زندگی اور موت کی اس سے بہتر تشریح ملنا محال ہے

وہ موت کا منظر لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

نام زشت موت سے اٹھتا ہے سینوں میں دھواں
فرق ہستی پر کڑک اٹھتی ہے دہشت کی کماں
دل پہ رکھ دیتا ہے خوف مرگ وہ بار گراں
بولنے لگتی ہیں سہمی زندگی کی ہڈیاں
کوئی نرم آواز، کوئی داستاں بھاتی نہیں
موت یاد آ جائے تو راتوں کو نیند آتی نہیں

جوشؔ کا یہ مجموعہ ایسی بے شمار دلآویز اور تاثراتی نظموں کا مرقع ہے ان کی فکر میں گہرائی بھی ہے اور موضوعات میں تنوع بھی۔ ہم جوشؔ کے تصورات و نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی انسان دوستی، خلوص اور ہمدردانہ فہم سے انکار نہیں کر سکتے ان کی نظمیں دراصل تاریخی مرقع ہیں۔ یہ وہ وارداتیں ہیں جو حقیقی اور واقعی ہیں۔ جوشؔ نے تاثر کو تصور میں ضرور تبدیل کیا ہے مگر تصور کو فلسفہ نہیں بننے دیا۔ اسی لئے ان کی شاعری شدید احساس کی شاعری ہے۔ وہ احساس کی نگاہ سے فطرت اور انسان کا مطالعہ کرتے ہیں ایک شاعر کی حیثیت سے ملک و قوم اور اس کے مسائل کا محاسبہ کرتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جوشؔ کی شاعری ہندوستان کی آواز ہے اردو شاعری نے ہندوستان کے حالات کا ایسا مزاج شناس فنکار دوسرا ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ خوبصورتی پر تاثرات میں تو بے صورتی پر شرمندہ ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال ان کی وطن دوستی برقرار رہتی ہے اس طرح سے جب ہم جوشؔ کے مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں ان کی ذاتی زندگی کے ساتھ پورے ہندوستان کے عوام کی دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

# جوشؔ کی شاعری میں رومانوی عناصر

اردو ادب میں "رومانیت" کی اصطلاح بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ موجودہ صدی کے اردو ادب میں مغربی ادب کے زیر اثر اس اصطلاح کا رواج ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک اہم اور غالب رجحان کی حیثیت سے رومانیت نے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اس کے ذریعے ہمارے ادب میں چند اہم تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں کہ رومانیت نے ہمارے تخلیق کاروں کو کافی متاثر کیا تھا اور اس کا اثر ان تخلیق کاروں کے فن پاروں پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے گو کہ بعض ناقدین کے نزدیک آج بھی یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے کہ اردو ادب میں رومانیت کو ایک میلان یا رجحان کہا جائے یا اسے ایک تحریک کا نام دیا جائے ایک مضمون بعنوان "اردو کے رومانی افسانہ نگار" میں لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ اردو ادب کی تاریخ میں باقاعدہ کوئی رومانی تحریک اس شکل میں رہی ہے جیسی یورپ کی تاریخِ ادب میں ملتی ہے شاید بڑا بحث طلب مسئلہ بن جائے لیکن اس بات سے کسی ذہین ادب نواز کو انکار نہ ہوگا کہ رومانیت کے جو اجزا اور عناصر ترکیبی ہیں وہ کم یا زیادہ اردو ادب کے اس دور میں فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں جسے دورِ جدید کہا جاتا ہے۔"[1]

گویا احتشام حسین اردو میں رومانیت کو باقاعدہ تحریک کا نام دیتے ہوئے ہچکچاہٹ

---

[1] سید احتشام حسین، اعتبارِ نظر، اشاعت اول ۱۹۶۵ء لکھنؤ ص۴۳

محسوس کرتے ہیں جب کہ اس ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی واضح انداز میں بڑی متوازن رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں :

> "تشدید ان معنوں میں اردو ادب میں رومانیت کو تحریک نہیں کہا جا سکتا جن معنوں میں یورپ خصوصاً انگلستان کے ادب میں اس کا نشان ملتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ تحریک شعوری کوشش اور تنظیم کے ساتھ شروع نہیں ہوئی البتہ اگر تحریک سے وسیع تر اشتراکِ قدر، روحانی ہم آہنگی اور فکری وحدت مراد لی جائے تو رومانیت کو اردو ادب کی بڑی تحریکات میں شمار کیا جائے گا" [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں سرسید تحریک کے بعد رومانیت ہی وہ منزل ہے جہاں سے ادب چند اہم تبدیلیوں سے روشناس ہوا۔

رومانویت اصل ایک لاطینی لفظ ROMANCE سے بنا ہے۔ جس کے معنی اُن عاشقانہ قصص و حکایات سے لئے جاتے ہیں جو پُر شکوہ اور نہایت آراستہ و پیراستہ انداز میں ہوا کرتے تھے اور جن میں ہر بات کو نہایت پر اثر، خواب ناک اور حسین شکل میں پیش کیا جاتا تھا اور اس میں پر اسراریت اور حیرت انگیزی کی کیفیات پیدا کر کے اس کی دلچسپی اور اثر میں اضافے کی سعی کی جاتی تھی۔ رومانوی ادیب "پاسبانِ عقل" کے قائل نہیں، وہ منطقی فکر کے بھی قائل نہیں کہ ان کے نزدیک انسانی جذبات و احساسات کی فطری شکل ہی سب سے اہم درجے کی حامل ہوتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں یورپ کی زندگی کے بیشتر شعبوں میں اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں جس کے نتیجے میں وہاں ایک نئے احساس نے جنم لیا۔ اس نئے احساس کا اثر جملہ فنونِ لطیفہ بالخصوص شعر و ادب پر گہرائی کے ساتھ مرتسم ہوا۔ یہی وہ احساس ہے جس نے آگے چل کر "رومانویت" کا نام پایا اور زبردست تحریک کی شکل میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

یورپ میں رومانویت کی تحریک کی ابتدا اور اس کے فروغ کے سلسلے میں فرانس کے

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک، ڈاکٹر محمد حسن (دیباچہ از رشید احمد صدیقی) اشاعت اول ۱۹۵۵ء علی گڑھ ص ۸

مشہور مفکر روسو کا نام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ شروع شروع میں روسو کے ذریعے اس تحریک کا تعلق سیاسیات سے بھی رہا ہے تاہم اس کا بنیادی مقصد مروجہ جمالیاتی اور ادبی اقدار پر کاری وار کر کے انھیں ختم کر دینا اور اس کے بعد نئی اقدار کو رواج دینا تھا۔ اس خصوص میں روسو کے افکار و عمل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسی لئے روسو کو نہ صرف رومانوی تحریک کا سب سے بڑا نمائندہ بلکہ بانی مبانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔

روسو انسان کا سب سے بڑا ہمدرد، قدر دان اور انسانی آزادی کا بڑا علم بردار اور نگہبان ہے۔ وہ بڑے تاسف کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ اگر چہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن جدھر دیکھو وہ زنجیروں میں گرفتار نظر آتا ہے۔ یہ زنجیریں مذہب و اخلاق کی اور سماجی قدروں کی مہیا کر دی ہیں۔ روسو کے نزدیک نیکی اور بدی اضافی قدروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ ان سے متاثر و مغلوب جذبات کو بھی "اچھے" اور "برے" دو خانوں میں تقسیم کرنے کا حامی نہیں۔ اس کا قول ہے کہ ایک خاص قسم کے جذبات کو سراہنا اور دوسرے قسم کے جذبات پر قدغن لگانا ایک نامناسب عمل ہے۔ تمام تر جذبات اعلیٰ و ارفع ہیں بشرطیکہ آدمی ان پر قابو حاصل کر سکے لیکن اگر آدمی ان کا غلام ہو کر رہ جائے تو انھیں کسی طور بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

رومانوی تحریک کی روحِ رواں جذباتیت تھی جس نے عقل پر جذبے اور وجدان کو ترجیح دی۔ گہری جذباتیت اور پر اسرار تصورات سے ایک خاص قسم کے تعلق کی بنا پر رومانوی ادیب و شاعر ایک طرف تو فطرت اور اس کے جمال کے پرستار بن گئے اور دوسری طرف باطن اور نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کی سعی کرنے لگے لیکن بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"یہ تحریک صرف چند سر پھرے نوجوانوں کا جذباتی ابال نہیں تھی بلکہ اقتصادی، سیاسی اور مجلسی نظام کا نتیجہ تھی۔ یہ نظام ان پرانے اصولوں پر پوری طرح پابند رہنے کو تیار نہیں تھا جنہیں ایک تغیر پذیر سماج میں ایک تغیر دشمن جاگیردارانہ ہاتھوں نے تعمیر کیا ہو۔ انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کی خاموش قوتیں نئی زندگی کی بساط بچھا رہی تھیں۔ اصول و ضوابط کے فلسفے بے جان ہو رہے تھے اور زمانہ نئے اصول مانگ رہا تھا۔ پرانے دستور کی گرفت نئی حقیقتوں کے لئے مفلوج کن تھی اور انسانیت کے ہاتھ کا ہتھیار رہنے کی

بجائے اس کی زنجیر بن گئی تھی۔ اس لحاظ سے ہربرٹ ریڈ نے کلاسیکیت کو
سیاسی استبداد اور ظلم کا ذہنی شریک کار قرار دیا ہے۔[1]

رومانوی تحریک کے علم برداروں میں روسو، شاتوبریاں، وکٹر ہیوگو اور لیمارتین نے فرانسیسی ادب میں، گوئٹے، شلر، نووالس، شلیگل اور ہرڈر نے جرمن ادب میں شیریڈن، جین آسٹن، کولرج، بلیک، بائرن، شیلے اور کیٹس وغیرہ نے برطانوی ادب میں اور تھورو، میل ول اور ایمرسن وغیرہ نے امریکی ادب میں قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ ان شہرۂ آفاق مصنفوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے فکر کے نئے افق روشن کئے۔ شعر و ادب کے شعبے میں اس تحریک کے جو عالمگیر اثرات وقوع پذیر ہوئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اہل نظر کی توجہ کا مرکز بن گئی۔
۲۔ جمال کے ساتھ ساتھ جلال پر بھی توجہ مرکوز کی گئی۔
۳۔ داخلی جذبات و کیفیات کی عکاسی کے وسیلے سے نفسیاتی نقطۂ نظر کو بھی اہمیت حاصل ہوئی جو کہ مستحسن ہے۔
۴۔ ذہن و عقل پر احساس اور وجدان کو ترجیح دی گئی۔
۵۔ شعر و ادب کو مروجہ کلاسیکی نظریات کی غلامی سے نجات دلائی گئی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فکر انسانی کی جدید تشکیل کے ضمن میں رومانوی تحریک نے زبردست خدمت سرانجام دی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

رومانوی شعراء نے اپنی زندگی میں درد کو بڑی اہمیت دی ہے اور انھوں نے اسے زندگی کے لئے ضروری شے قرار دیا ہے۔ اپنے دل کے دکھوں کو ایک مقصد کے تحت برداشت کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ اور حسن تک رسائی کے لئے اسے اپنے سینے سے لگایا ہے۔ رومانوی ادب پاروں میں اسی لئے ہمیں درد بھی صاف نظر آتا ہے جسے وہ خوشی خوشی برداشت کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح رومانوی فنکاروں نے ماضی کو بھی اپنے گلے سے لگایا ہے اور اس ماضی کی جستجو میں وہ بعید ترین زمانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کو انگریزی میں DETACHMENT

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن: اردو ادب میں رومانوی تحریک ص۲

کہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رومانوی فنکاروں کے یہاں ہمیں مافوق الفطرت عناصر بھی نظر آتے ہیں اور ان فنکاروں کے یہاں انقلاب، آزادی اور مساوات کا جذبہ بھی ہمیں صاف اور نمایاں دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ لوگ زندگی میں کسی قسم کی پابندی کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو شاعری میں رومانوی عناصر ملنے کا تعلق ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان میں بھی مغرب کی طرح اس نظریہ کو اسی زمانے میں اپنایا تھا جب مغرب میں یہ تحریک سرگرم عمل تھی اس وقت تو ہماری اردو شاعری ارتقا کے منازل ہی طے کر رہی تھی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہمارے شعرا کے یہاں ابتدا ہی سے رومانوی عناصر کچھ بکھرے بکھرے نظر آتے ہیں، مگر ہمارے ادب میں عہد وسطیٰ میں انقلاب کے طور پر یہ تحریک نہیں آئی بلکہ دھیرے دھیرے اس کے اثرات ہمارے ادب پر پڑے۔ رومانوی عناصر کا تھوڑا احساس ہمیں اردو کی غزلوں میں ہوتا ہے۔ مگر یہ احساس شعرا کی خستہ حالی کی وجہ سے ہے نہ کہ اس تحریک کی وجہ سے۔ ہمارے شعرا نے محبوب کی خاطر خستہ حالی اور خطر پسندی کو اپنا کارنامہ سمجھا اور محبوب کی خاطر ہی خطرات کو گوارا کیا۔ ہماری شاعری میں عشق و محبت کی داستانیں شروع سے ملتی ہیں جن کو ہم رومان کے اجزا کہہ سکتے ہیں۔

ابتدا میں نظیر کی نظموں میں اور دوسری اصناف میں میر حسن، سودا اور انیس وغیرہ کے کلام میں ہمیں غیر معمولی شان و شوکت اور محاکاتی تفصیل پسندی بھی ملتی ہے ۔ جن میں رومانوی عناصر کا وجود صاف نظر آنے لگتا ہے۔ قدامت پسندی والا نقطۂ نظر ہمیں اردو شاعری میں خاص طور سے واضح نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعری طویل مدت تک قدامت پسندی کی طرف مائل رہی اور روایت شکنی کا وہ عمل جس سے رومانویت عبارت ہے۔ اس میں بہت بعد میں پیدا ہوا۔ روایت پرستی کا یہ طور محض شاعری ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ شرقی زندگی کے کم و بیش ہر شعبے میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرق میں روایت شکنی کی رفتار نسبتاً سست ہے اور مغرب میں روایت شکنی کی تاریخ ماضی میں کئی صدیوں کو محیط ہے۔

دورِ جدید میں جب ہم اردو ادب و شاعری کے سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں تو حالی کے اصولوں میں ہمیں رومانویت کی جھلک نظر آتی ہے حالی نے بھی پرانے اصولوں سے منہ موڑنے کی شاعروں کو صلاح دی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ پوری طرح پرانے اصولوں کو ترک نہیں

کرسکے تھے۔ آزاد کو بھی ہم اسی طرح رومانوی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ بھی بندھے بندھائے اصولوں پر ہی چلے انحراف تو انھوں نے کیا مگر پوری طرح رومانویت نہیں برت سکے لیکن پھر بھی حالی اور آزاد کا نام اردو میں رومانیت کے سلسلے میں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے قدیم اصولوں سے انحراف کیا اور شاعری کے نئے اصول وضع کئے جس سے تھوڑی بہت ان کی رومانوی روش کا پتہ چلتا ہے۔

جدید شاعروں میں سب سے پہلے رومانوی عنصر ہمیں اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔ اقبال کی نظموں میں مذہبی عنصر کو بھی ہم رومانیت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اقبال مذہب کو ڈر کر اختیار نہیں کرتے انھوں نے خدا سے بھی بے باکی اور جسارت سے باتیں کی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کا مذہبی تصور عام تقدیر پرست مسلمانوں کے مذہبی تصور سے بالکل جدا تھا تو غلط نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ظل حسین عابدی لکھتے ہیں کہ۔

"اقبال کی شاعری میں ہمیں ایسے اجزا بکثرت ملتے ہیں جو اسباب کا پتہ دیتے ہیں کہ رومانیت کیا ہے۔" [1]

اقبال نے جو فلسفۂ خودی اور مومن کا تصور پیش کیا ہے وہ بھی رومانیت کی دلیل ہے اسی طرح ان کے شاہین کا کبوتر پر جھپٹنا خون گرم کرنے کے لئے حرارت کو برقرار رکھنے اور زندگی کا لطف لینے کے لئے ہے یہ بھی رومانوی عنصر سے مملو ہے یہ ان کی خطر پسندی اور جذبہ پرستی کا رجحان ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال عقل پر جذبہ کو حاوی رکھتے تھے اسی جذبے پر انھوں نے بار بار زور دے کر اس کی برتری ثابت کی ہے۔

مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال کی شاعری میں رومانوی عناصر اس قدر ہیں کہ اگر انھیں ایک بڑے رومانوی شاعر کا درجہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اردو شاعری میں رومانوی تحریک کے اولین رہنماؤں میں اقبال کے علاوہ عظمت اللہ کا نام خاصہ اہم ہے۔ عظمت اللہ نے

---

[1] "جدید شاعری اور رومانوی تحریک" مطبوعہ ماہنامہ "نگار" سالنامہ ۱۹۳۵ء ص ۲۲۱

جذبات اور تخیل کو ہم آہنگ کر کے ایک مثال قائم کی ان کا مجموعہ "سریلے بول" کی نظمیں اور گیت اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ رومانوی شاعر ہیں عظمت اللہ نے شاعری میں لے پر خاص توجہ دی ہے اور جذبات کو بھی لے میں ڈھال کر پیش کیا ہے انھوں نے اس طرح رومان نگاری کی بہت سی مثالیں چھوڑی ہیں۔ ان کی مشہور رومانی نظموں میں "برکھا کا پہلا مہینہ"، "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"، "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا"، اور "میل" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عظمت اللہ نے انگریزی نظموں کے ترجمے اور ہندی طرز کی نظمیں لکھ کر بھی رومانوی تحریک کو تقویت پہنچائی۔

رومانوی شاعروں میں احسان دانش کا نام بھی کافی اہمیت رکھتا ہے انھوں نے نچلے اور مزدور طبقے کے عوام کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا انھوں نے اپنے تخیل سے غریبوں کے جذبات اور احساسات اور دکھ درد کے نقشے کھینچے اور لکھا۔

احسان ازل ہی سے میں پروردۂ غم ہوں
اشکوں میں ابھی گرمیِ محفل کو بدل دوں

اردو میں رومانیت کے سلسلے میں حامد اللہ افسر بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ افسر نے جذبات و احساسات کے مرقع اپنی نظموں میں پیش کئے اور فکر کے بجائے لطافتِ احساس سے زیادہ سروکار رکھا۔ افسر ٹیگور کی رومانیت سے متاثر تھے۔ نازک احساسات و جذبات کو انھوں نے اپنی نظموں میں سمویا۔ اگر کہیں ان کے جذبے کو قوافی سے چوٹ لگتی ہوئی نظر آئی تو انھوں نے بغیر قافیہ کی نظمیں لکھیں رومان سے متعلق ان کی "مسافر" نے خاص مقبولیت حاصل کی تھی۔

رومانوی تحریک کو کامیاب بنانے والوں میں حفیظ جالندھری کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اپنی نظموں میں نغمگی اور ترنم کے ساتھ ہی ساتھ جذباتیت سے پُر نظمیں کہیں۔ حفیظ نے ملی جذبے کو "شاہنامہ" کے روپ میں پیش کیا اور کئی خالص رومانوی نظمیں لکھیں۔ ان کے مجموعے "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" کی نظمیں رومانوی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں جس میں انھوں نے خالص رومانوی انداز اختیار کیا اور لطیف جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے

رومانیت کو مقبول بنانے والوں میں اختر شیرانی کا نام بھی کافی اہم ہے اختر شیرانی نے حسن کو روحانی قدر سمجھا اور ان کی نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن اور ذہن و

دل اور جسم و جان پر اس قدر حاوی اور مسلط ہو گیا ہے کہ انھیں ہر جنبش نگاہ میں حسن ہی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ان کے کلام میں مسرت و شادمانی کی کیفیات نظر آتی ہیں لیکن یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اختر شیرانی عورت کو صرف محبوبہ کی نظر سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ انھوں نے "ماں" جیسی نظم لکھ کر عورت کی عظمت کی تائید بھی کی ہے اور "نور جہاں" لکھ کر عورت کی مختلف خصوصیات اور خوبیوں کو وسیع نظر سے دیکھا ہے اختر شیرانی کی نظموں میں ہمیں انقلاب کی خواہش بھی ملتی ہے اور مفلس و نادار لوگوں کی ہمدردی بھی ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اختر شیرانی نے اسالیب کو بھی نئی روح اور نئے سانچے دیئے ہیں۔

اختر شیرانی کے علاوہ ساغر نظامی، روش صدیقی اور اختر انصاری کے نام بھی رومانوی فن کاروں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ساغر نظامی نے اپنی نظموں میں ہندوستانی دیہاتوں کی تصویریں پیش کی ہیں اور ملک و قوم کے مسائل کو حسین انداز میں نغمگی کے ساتھ پیش کیا ہے روش صدیقی نے اپنی نظموں میں حسن و عشق کے موضوعات کے ساتھ ہی سیاسی سوجھ بوجھ کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کشمیر اور اس کے حسن پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں مناظر فطرت کی بہترین عکاسی کی ہے ان کی نظم "مگر اے حسین دیوی مجھے تجھ سے ہے محبت" کافی مقبول رہی ہے۔ اختر انصاری نے مغربی شعراء سے متاثر ہو کر مغربی انداز میں رومانوی نظمیں لکھیں اختر انصاری نے قطعات پر خاص توجہ دی ان کے قطعات کا مجموعہ "آبگینے" کے نام سے شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے شدید احساس جمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا شعراء اردو ادب میں رومانوی شاعری کے نمائندے ہیں ان شاعروں کا ذکر کرنے کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں رومان کا عنصر کس حد تک کارفرما ہے جیسا کہ لکھا جا چکا ہے لفظ رومان کسی بندھے ٹکے مفہوم سے عبارت نہیں ہے اس کا مفہوم ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے تاہم بعض امور سے اس کی واضح شناخت ہوتی ہے جیسے جذبہ پسندی، ماضی پرستی، انفرادیت پسندی، بازگشت بفطرت پر زور، روایت شکنی پر اصرار آزادی، مساوات اور انسان دوستی جیسی اقدار کو ترجیح، تخیل کی تخلیقی صلاحیت پر اصرار وغیرہ امور اس کے خمیر کا حصہ ہیں رومانوی شاعر عموماً اپنے عہد سے بیزار ہوتا ہے۔ اس کی گفتار میں شدت

ہوتی ہے۔ وہ اپنے اضمحلال، کرب اور ملال کا برملا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اس کے تجربے صادق اور اس کی زبان اثر انگیز ہوتی ہے۔ جوش بذات خود نہایت جذباتی انسان اور شدت جذبات کے پرستار بھی ہیں ان کے ذہن و دل پر جذبہ اور رومان کا ایسا غلبہ ہے کہ وہ جو بھی موضوع قلمبند کرتے ہیں وہ انداز بیان اور طرز تخیل کی وجہ سے رومانوی ہو جاتا ہے اتنا ہی نہیں جب وہ سیاسی یا مذہبی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تب بھی ان پر رومانیت غالب ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جوش کو سوفی صدی رومانوی شاعر قرار دیتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں :

> "جوش سوفی صدی رومانوی شاعر ہیں اور ان کا انقلاب کا تصور بھی رومانی ہے جس کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں اور مجاہد کی شان سے نیزہ ہلاتے اور تلوار چلاتے میدان میں اتر آتے ہیں یہ جوش کی رومانی فطرت ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ کبھی ان کا انقلاب مٹھیوں میں افشاں بھر کر چلتا ہے اور کبھی سرمایہ داروں کی ہڈیاں چباتا ہوا۔ کبھی وہ نئی دلہن کی طرح خوبصورت ہوتا ہے کبھی دیو کی طرح مہیب و دہشت ناک۔ اسی رومانی انقلاب پرستی کے زیر اثر وہ کبھی کبھی اپنے ابنائے وطن سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ نفرت اور حقارت کا اظہار کر رہے ہیں ........ اصل میں ان کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے۔" [1]

رومانوی شاعر کی جو خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ تقریباً پوری کی پوری جوش میں موجود ہیں اور اصل وہ ہیں بھی رومانوی شاعر۔ زندگی انہیں عزیز ہے، ماضی سے انہیں لگاؤ ہے۔ انفرادیت پسندی کا جا بجا وہ اظہار کرتے ہیں، درد اور کسک ان کی شاعری میں موجود ہے تخیل کی بے محابا جولانیاں بھی ان کے کلام میں موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر جذباتیت تو شروع سے آخر تک ہے ہی وطن سے محبت اور آزادی کا تصور بھی جوش کے یہاں ہے جسے رومانویت کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے انہیں وجوہات کے پیش نظر ناقدین ادب نے جوش کو سوفی صدی رومانوی شاعر مانا ہے۔

---

[1] ترقی پسند ادب از سردار جعفری ص ۱۴۵

جوشؔ نے اپنی نظموں میں انقلاب اور آزادی کا جو تصور پیش کیا ہے وہ سر تا سر جذباتی ہے۔ وہ زندانوں اور زنجیروں کے ٹوٹ جانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ آزادی کے پرستار ہیں مگر کوئی واضح تصور یا نقطۂ نظر نہیں پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا نظریہ کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک جذباتی اور لاابالی طبیعت کے مالک تھے بہرحال انھیں محکومی اور غلامی پسند نہیں تھی۔ ان کی ایک نظم اپنے غلاموں سے خطاب۔ اس میں وہ کہتے ہیں۔

اکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاج سنگ
خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ
تو چپ رہا زمین ہلی آسماں ہلا
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلہ
ان بزدلوں کے نام پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں

جوشؔ نے اس قسم کی نظمیں اس لئے لکھیں کہ عوام میں بیداری کا جذبہ پیدا ہو اور زندگی جو اپنی فطرت میں ایک آزاد شے ہے۔ قید و بند سے آزاد ہو سکے اس لحاظ سے ان کی دو نظمیں "زوال جہانبانی" اور "بغاوت" خاصی اہم ہیں ان نظموں میں انھوں نے فرد کی اہمیت جتلائی ہے اور جوشؔ کا خیال ہے کہ انسانیت کی تکمیل بغیر آزادی حاصل کئے ممکن نہیں ہے۔

حسن و عشق جوشؔ کی شاعری کے محبوب موضوعات ہیں جن کے مختلف پہلوؤں کو مختلف انداز میں انھوں نے بیان کیا ہے جوشؔ کی رومانیت کے اثرات ہمیں ان کی ایسی نظموں میں نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ حسن کے شیدائی ہیں اور حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ حسن کہیں بھی ہو بغیر کسی جھجک کے وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی نگاہیں حسن کی متلاشی رہتی ہیں شاید اسی لئے وہ صنف لطیف کے حسن کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کی نظم "جنگل کی شہزادی" میں حسن کی جزئیات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کانوں پہ خوبصورت ایک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب، گل رخ، کافر دراز مژگاں
سیمیں بدن پری رخ، نوخیز مشر ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع ماہ پیکر
نازک بدن شکر لب شیریں ادا فسوں گر
ابرو ہلال، میگوں، جاں بخش روح پرور
نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار دلبر
آہو نگاہ، لورس، گل گوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا
غارت گر تحمل، دل سوز، دشمن جاں
پروردہ مناظر، دوشیزہ بیاباں

جوش کی ایک اور نظم "گنگا کے گھاٹ پر" میں ان کا یہی انداز دیکھئے۔

عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہا ہے بدن کم سنی کی خوشبو سے
مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے
جبین شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے

"کوہستان دکن کی عورتیں" نظم میں محنت کش عورتوں کے فولادی حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ والاماں
لیجے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز تیکھا شباب

اسی طرح "فتنۂ خانقاہ" میں حسن زاہد و پیر طبعوں پر جس طور پر اثر انداز ہوتا ہے اس کا احوال وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

بڑھ کر جو فاتحہ وہ ایک سمت پھر گئی
ایک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی
زاہد حدودِ عشق خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصّہ دین کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

جوشؔ کی عشقیہ شاعری میں ان کے مزاج کی رومانیت بدرجۂ اتم موجود ہے عشق و عاشقی کے مختلف موضوعات پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں وہ عشق کو عبادت تصور کرتے ہیں مگر عشق کے وقار کو کبھی کم نہیں ہونے دیتے۔ عشق کی ان کیفیات کا بیان جوشؔ نے اپنی بہت سی نظموں میں کیا ہے۔ ان کا عشق ناکام نہیں ہے بلکہ وہ کامیاب عاشق ہیں اس لئے ان کی عشقیہ نظموں میں شادمانی کی کیفیت جابجا نظر آتی ہے۔ ان کا عشق زندگی کی کامیابیوں کا راز ہے وہ حسن کے اسیر نہیں بلکہ عشق کی وجہ سے حسن خود ان کے پاس کھنچا چلا آتا ہے وہ حسن سے زیادہ جذبۂ عشق پر یقین رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ صنفِ لطیف کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کی والہانہ تعریف کرنے لگتے ہیں اس سلسلے میں وہ ذات پات، سماجی بندھن وغیرہ سب کچھ بھول جاتے ہیں "حسن اور مزدوری"، "جامن والیاں"، "مالن"، "مہترانی"، "کوہستانِ دکن کی عورتیں"، "جنگل کی شاہزادی" وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں، ان نظموں میں حسن کی افسردگی اور غمگینی سے وہ رنجور دکھائی دیتے ہیں انھیں دراصل حسن کا غمگین ہونا پسند نہیں وہ ایسے دکھ درد کو اپنے دل پر گراں سی تصور کرتے ہیں اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورت کے حسن کا تصور جوشؔ کے یہاں مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے بھی رنگینیاں بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے وہ زندگی کو شاد کرتا ہے انھوں نے حسن کو مرد کے لئے نشاط کا ذریعہ اور حسن کی فضیلت عورت کی نزاکت اور نسائیت میں پوشیدہ ہونا بتایا ہے وہ عورت کو سخت کوشش مردانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر کوفت محسوس کرتے ہیں بہرحال جوشؔ نے اپنی نظموں میں حسن اور عشق کے جذبات و احساسات کو خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش

کی ہے۔ جس سے ہم ان کے مزاج کی رومانیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں ان کی اس قسم کی شاعری انھیں رومانوی فن کاروں میں ایک اہم مقام پر فائز کرتی ہے اور وہ ان میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

جوشؔ نے اپنی نظموں میں جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ زندگی اور زندہ دلی کے جذباتی پہلوؤں پر ان کی نظر کافی گہری تھی، حسن و عشق اور ان کے باہمی رشتوں پر جوشؔ نے تاثراتی انداز سے نظمیں کہیں۔ انقلاب اور آزادی کے موضوع پر بھی ان کی نظمیں جذبات نگاری کے بہترین مرقع ہیں۔ مناظر فطرت اور دوسرے وقتی مسائل پر بھی وہ بے حد جذباتی ہو کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عام انسانی جذبات کی فراوانی صاف اور نمایاں محسوس کی جاسکتی ہے اور حساس دلوں پر تو اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں بچپن کے حسین دن، جوانی کی حسین راتیں، بڑھاپے کی کمزوریاں اور ناکامیاں سبھی کچھ ملتا ہے۔ ایسی نظموں میں "حقیقت دل"، "پرانی تصویریں"، "اترے ہوئے چہرے" وغیرہ ماضی کی یادیں دلاتی ہیں۔ "اترے ہوئے چہرے" میں جذبات نگاری دیکھئے۔

آہ وہ لوگ جو تھے میرے لڑکپن میں ظریف
جن کو ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا
میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل
رنگ رلیوں میں ہی کٹتا تھا زمانہ جن کا
ان کے بعد اب ہیں کچھ اس درجہ ملول و غمناک
کہ انھیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا

"ماں جائے کی یاد" نظم میں بھی وہ بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بھائی بہن کے جھگڑوں اور ملن اور آپسی محبت کی داستان سناتے ہیں۔

میں دیس میں اور تم وطن سے باہر
اے بھائی بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا
ساون کی ہے رت ہوا ہے پروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے
استادہ جھولا دو شجر پہ

ایک موجِ رواں ہے ایک چمن ہے
ایک نکھرے بھائی ایک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں
کیا جانے کیوں جھگڑ رہے ہیں
اس جنگ کے آئینہ کے اندر
بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر
کرتے ہیں شرارتیں ادھر بھی
لڑتے تھے اس طرح سے ہم بھی

یہ نظم بھی مکمل طور پر جذباتی ہے جوشؔ کو ان کا بچپن یاد آتا ہے بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کا زمانہ یاد آتا ہے۔ "پرانی تصویر" میں بھی جوشؔ نے بچپن کا نقشہ نہایت دل نشیں انداز میں کھینچا ہے وہ اس زمانے کے گزر جانے پر اظہار تاسف بھی کرتے ہیں۔

زندگی میں پھر نہ اس موسم کو پائیں گے کبھی
ہائے وہ بیتے ہوئے دن اب نہ آئیں گے کبھی

اس نظم میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوشؔ اپنے ماضی میں گم ہو گئے ہیں یہ نظم جذبات نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔ انسانی جذبات اور احساسات پر ان کی ایک اور نظم ہے "بن باسی بابو" اس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں۔

جنگلوں کے سرد گوشے ریل بل کھاتی ہوئی
جبل کے سینے پہ زلف علم لہراتی ہوئی

ریل کے دھویں، اس کی چال اور آواز کا ذکر کرتے ہوئے جوشؔ نے جنگل میں دور واقع ایک اسٹیشن کا نقشہ کھینچا۔

ایک اسٹیشن فسردہ، مضمحل، تنہا، اداس
جھٹپٹے کی بدلیاں پُر ہول جنگل آس پاس

| | |
|---|---|
| ملگجے نالے اندھیری وادیاں ہلکی پھوار | جس جگہ دیکھو کوسوں تک کھجوروں کی قطار |
| قدآدم گھاس، گہری ندیاں اونچے پہاڑ | ایک اسٹیشن فقط اے دیکھے باقی سب اجاڑ |
| کاش جا کر بابوؤں سے جوشؔ یہ پوچھے کوئی | جنگلوں میں کٹ رہی ہے کس طرح سے زندگی |

اس نظم میں جوش نے جنگلوں میں بنے ہوئے اسٹیشنوں پر کام کرنے والے ان بابوؤں کی حالت کا نقشہ بھی پیش کر دیا ہے جو محض نوکری کی خاطر ان دور دراز علاقوں میں رہنے پر مجبور ہیں حالانکہ ان کا بچپن اور جوانی کا زمانہ شہروں میں گزرا ہے جوش ان سے یوں سوال کرتے ہیں۔

پی کہو اٹھتے ہیں جب بادل اندھیری رات میں
جب پپیہا کوک اٹھتا ہے بھری برسات میں
شب کو ہوتا ہے گھنے جنگل میں جب بارش کا زور
سائیں سائیں بھیگی ہوئی راتوں میں جب کرتا ہے شور
روح تو اس وقت فرط غم سے گھبراتی نہیں
تم کو اپنے عہد ماضی کی تو یاد آتی نہیں

اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں،

"اس نظم میں نہ صرف یہ کہ جن باسی بابوؤں کی زندگی کے بعض جذباتی پہلوؤں کی ترجمانی ہے بلکہ اس جذباتی حقیقت کی تصویر کشی بھی ہے جو وطن سے دور رہنے والے کسی انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب رات کو بادل گھر آتے ہیں موسلا دھار مینھ برستا ہے اور کہیں دور سے پپیہے کی آواز آتی ہے اس عالم میں ماضی کی یادیں دل میں جذبات کے کچھ طوفان اٹھاتی ہیں۔"[1]

غرض یہ کہ جوش نے زندگی کے کئی اہم پہلوؤں پر نظمیں کہی ہیں اور جذبات نگاری میں بھی جذبے کو ابھارنے کے ساتھ جذبے کی قدر کرنے کا بھی احساس دلایا ہے اور اس طرح نئی روایت کا بھی آغاز کیا ہے۔ ان کی جذبات نگاری اس لئے بھی رومانوی فن کاروں میں ایک مستقل اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔ جوش کی نظموں میں ماضی سے ان کے لگاؤ محبوب سے جدائی پر اظہار غم ان کی اداسی میں دل کا درد و الم بھی صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان کی نظم "ربودگی"۔ "گم شدگی"۔ "سوئے جنت"۔ "الوداع"۔ "تعاقب"۔ "پیاجن ناگن کالی رات"۔ "پہلی مفارقت"۔ "شام رخصت"۔ "تو اگر واپس نہ آئی" اور "وداع جاناں" وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ "ربودگی" میں ان کی اداس کیفیت دیکھئے۔

---

[1] "جدید شاعری" از ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۲۲

ہو چکا ہے غروب بدر منیر — سامنے اب نہیں کوئی تصویر
جو چلا ہے اداس ہر منظر — کیوں میں بیٹھا ہوں اب پہاڑی پر

جوشؔ جب اداس ہوتے ہیں تو ان کو پورا ماحول اداسی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے اور روئے عالم پر اس کا اثر وہ دیکھتے ہیں اپنی نظم "گم شدگی" میں وہ کہتے ہیں۔

دن نے ٹھنڈی سانس لی خورشید اوجھل ہو گیا
رنگ اڑا صحرا کا اور خاموش دریا ہو گیا

اڑ گیا رنگ شفق، دل چرخ کا تھرا گیا
رفتہ رفتہ روئے عالم پر دھواں سا چھا گیا

"پیا بن ناگن کالی رات" میں ایک عورت کی اس کے محبوب کے فراق میں جو حالت ہوتی ہے اس کا بیان کرتے ہوئے اس کے دل کا درد اپنے اشعار میں اتار دیتے ہیں۔ رومانوی فن کار ہونے کے ناطے وہ فطرت کے بھی پرستار ہیں جوشؔ کو ابتدا ہی سے مناظر فطرت اور اس کے حسن سے والہانہ لگاؤ رہا ہے انھیں فطرت کے ذرے ذرے سے پیار رہا ہے وہ فطرت کے حسین جلووں کو اس انداز سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی فطرت کے حسن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اسی ہم آہنگی کو وہ اپنی نظم "نغمۂ سحر" میں اس طرح بیان کرتے ہیں

سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں
مرا دماغ سحر پرستی ہمیشہ اس وقت جاگتا ہے
فلک پہ جس وقت چاند ہوتا ہے نگہِ خواب پیرہن میں

جیسے ان کی یہ محبت ہی تھی کہ انھوں نے ملیح آباد میں آبادی سے دور ایک محل مناظر فطرت کے مطالعے اور مشاہدے کے لئے تعمیر کرایا تھا جس کا نام "قصر سحر" رکھا تھا فطری حسن اور مناظر قدرت سے وابستگی کا یہ عالم تھا۔

چھوڑ کر انسانوں کو میں فطرت کا شیدا ہو گیا
خوبیِ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہمدم سبزہ زار و کوہ و صحرا ہو گیا
دوست میرا چشمۂ گلزار و دریا ہو گیا

مہ کو حلقے میں تبسم نے لیا خورشید کے
شامِ غم رخصت ہوئی جلووں میں صبحِ عید کے

اپنی سحر پرستی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ جوشؔ کہتے ہیں۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوشؔ نے مناظرِ فطرت کے مختلف پہلوؤں پر رومانوی انداز سے بھرپور بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں "سیرِ گردوں" "چاندنی" "برسات کی پہلی گھٹا" "بدلی کا چاند" "البیلی صبح" "بہار آنے لگی" "برسات کی شفق" "منہ اندھیرے" "شام کی بزم آرائیاں" "برسات کا پچھلا پہر" وغیرہ سدابہار نظمیں کہلاتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اردو ادب میں جوشؔ کا ایک اہم اور منفرد مقام ہے۔ فطرت اور اس کا حسن جوشؔ کے یہاں بے جان نہیں بلکہ وہ حیات آفریں اور حیات خیز ہے۔ جس طرح حسنِ نسوانی ان کے احساس پر جادو کا سا اثر کرتا ہے اسی طرح فطرت بھی ان کے سارے وجود پر اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ ایک جگہ ان کا ارشاد ہے۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اور حقیقتاً وہ اہلِ نظر کو حق کا ثبوت بہم پہنچا دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نے لکھا ہے کہ؛

"جوشؔ فطرت کے شاعر ہیں ان کے کلام میں آبشاروں کا جوش و خروش و ترنم ہے۔ دریا کی روانی، موجوں کا تلاطم ہے، بادِ سحر کی نرمی و سبک خرامی ہے۔ ان کی شاعری وہی بے ترتیبی میں ترتیب اور تنوع میں ہم آہنگی ہے جو فطرت کا طرۂ امتیاز ہے۔"[1]

ڈاکٹر محمد حسن بھی کم و بیش یہی تاثر رکھتے ہیں ان کے خیال کے مطابق؛

"فطری مناظر کی جو پُرکیف اور پُرجوش عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے اس کی نظیریں ہمارے ادب میں بہت کم ہیں ۔۔۔۔ جوشؔ کے یہاں فطرت ایک

---

[1] اثر کے تنقیدی مضامین از جعفر علی خاں اثر لکھنوی ص ۲۰-۲۹

مثبت وجود ہے جو منافی نہیں، محتاجِ نظر بھی نہیں ہے۔ مگر اس کے گرم لمس
اور حیات آفریں نفس میں وہ شادابی ہے جو مردوں میں جان، جذبات میں طوفان
بپا کردے۔ ل

بلاشبہ جوش اپنے صحیح معنی میں ایک رومانوی فن کار ہیں۔ ان کا تخیل زبردست پیکر سازاد
قوت رکھتا ہے۔ وہ تصویریں اور مرقعے ہی پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے نقش حرکات سے معمور ہوتے
ہیں۔ محاکاتی تفصیل نگاری میں ان کے کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ اردو نظم میں اس لحاظ سے وہ
اپنے اسلوب میں یکتا اور انتہائی درجہ منفرد ہیں۔ انھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ انسانی وارفتگی کے
نغمے گاتے ہوئے زندگی کی قدر کرنا سکھایا ہے۔ ان کی رومانویت خالص سماوی یا تخیلی بھی نہیں ہے
بلکہ وہ ارضی ہے اور حقیقت کی بنیاد پر اس کی تعمیر ہوئی ہے۔

---

ل "شناسا چہرے" از ڈاکٹر محمد حسن ص ۲۸-۲۹

اردو کے ممتاز ترقی پسندوں میں جوش کا نام لیا جاتا ہے اور دورِ حاضر کے بیشتر ناقدین ادب نے ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے جوش کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں جوش کا قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے ہی جوش اس سے متعلق ہو گئے تھے اور آخر تک نہ صرف یہ کہ اس تحریک کے ساتھ رہے بلکہ اپنی تخلیقات میں ترقی پسندانہ نظریات سے استفادہ بھی کیا۔ لیکن جب ہم جوش کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے یہاں ہمیں بہت سے وہ موضوعات ابتدا سے ہی کارفرما دکھائی دیتے ہیں جو ترقی پسند شعرا کے یہاں خصوصیت کے حامل ہیں جوش کی شاعری کا زمانہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی شروع ہو گیا تھا اور جوش نے اپنی شاعری کی ابتدا سے ہی اپنی نظموں میں ایسے موضوعات اختیار کرنا شروع کر دئے تھے جو ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد اردو شعرا نے اپنی تخلیقات میں اختیار کئے۔ شاید اسی لئے سردار جعفری نے جوش کو ترقی پسند شعرا کے قبلۂ رندانِ جہاں ایسے لفظوں سے یاد کیا ہے۔ [1]

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا مگر یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ترقی پسند تحریک کا آغاز اچانک نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تحریک بیسویں صدی کے ابتدا سے ہی رونما ہونے والی معاشی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا نقطۂ ارتقا تھی۔ اس لحاظ

---

[1] ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔ علی سردار جعفری ص۴۲

سے جوش کی شاعری میں ترقی پسندانہ عناصر کا ملنا تعجب خیز نہیں۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے ہوا تھا۔ جس کی صدارت اردو کے ممتاز افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی تھی اس کانفرنس میں ہندوستان کی سب ہی زبانوں کے ادیب اور شاعر جمع ہوئے تھے۔ کانفرنس میں حصہ لینے والوں میں حسرت موہانی، جے پرکاش نارائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے، میاں افتخار الدین، چودھری محمد علی، جینیندر کمار، فراق گورکھپوری اور مہر علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں ادب کی مقصدیت پر زور دیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام سے تہذیب و کلچر کو جو خطرات تھے ان سے ادیبوں کو آگاہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ فن کار کا منصب یہ ہونا چاہئے کہ وہ ادب کے ذریعہ انسانیت، جمہوریت، اور اخوت، و مساوات جیسی اقدار کو ترجیح دے۔ اس کانفرنس میں ایک منشور پاس کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ :

"اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوا دوار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈتا رہا ہے جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں ان کا فرض ہے کہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے ان کا فرض ہے وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔" [1]

---

[1] "ترقی پسند ادب" از سردار جعفری ص ۲۳-۲۴

لکھنؤ کی اس کانفرنس میں منشی پریم چند نے درج ذیل انقلابی خیالات کا اظہار کیا :

"ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی ..... اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں، جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں" [1]

"انجمن ترقی پسند مصنفین" کی اس کانفرنس میں انجمن کے جو مقاصد طے ہوئے وہ درج ذیل تھے

"۱۔ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرکے اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲۔ ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کرکے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا

۳۔ ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

۴۔ آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کرنے کی کوشش کرنا" [2]

اس تحریک کو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیب اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا بعد ازاں وہ تمام فن کار تحریک کے مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہوگئے اردو کے کئی ادیب اور شاعر اس انجمن کے ممبر بنے اور ایک طرف تو انھوں نے انجمن کی مقبولیت اور وسعت کے لئے کام کرنا شروع کیا اور دوسری جانب ایسا ادب تخلیق کیا جو انجمن کے منشور پر پورا اترتا تھا۔ ان کوششوں کا نتیجہ بہت مفید نکلا۔ انجمن کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا اس کے ممبران کی تعداد بڑھنے لگی۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ اور ایسے ادب پارے وجود میں آنے لگے جن میں انجمن کے نظریات کی پابندی کی جاتی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے چنانچہ اس کے

---

[1] "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" از خلیل الرحمن اعظمی ص [illegible]

[2] ایضاً ص [illegible]

اثرات اردو کی مختلف اصناف پر پڑے۔ اور ایسا ادب وجود میں آنے لگا جس میں اظہار ذات اور انفرادیت پر سماج اور اجتماعیت کو ترجیح حاصل تھی اور جو اشتراکی طرز کے غیر طبقاتی نظام کا مؤید وحامی تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں اشتراکی نظم حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سامراج بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور میں ترقی پسندوں نے ہندوستان کی سیاسی تحریک آزادی کی حمایت بھی زور وشور کے ساتھ کی۔ اور عوام کو سامراجی قوتوں کے خلاف صف آرا کرنے کے لئے سامراجیت کی برائیوں اور غلامی کی ذلتوں کا احساس دلایا اور اجتماعی کوششوں کی اہمیت کو واضح کیا اور انقلاب کی افادیت سے باخبر کرنے کی کوشش کی۔

لکھنؤ کے بعد ۱۹۳۷ء میں الہ آباد میں دوسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اردو ہندی کے بہت سے ادیب شریک ہوئے اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں اردو کے ادیبوں کے علاوہ جے پرکاش نارائن، شیودان سنگھ چوہان، نریندر شرما اور چیش چندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں مولوی عبدالحق نے خطبہ صدارت پڑھا۔

اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں الہ آباد میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس ترقی پسندوں کی دوسری بڑی اہم کانفرنس تھی۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں حیات اللہ انصاری، فیض، مجاز، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا، فراق، امرت رائے، احتشام حسین، اعجاز حسین اور وقار عظیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لئے آنند نرائن ملا، ہندی کے مشہور ادیب سمترا نندن پنت اور جوش ملیح آبادی کے نام تھے جنھوں نے خطبۂ صدارت پڑھے۔ گجراتی کے ادیب کاکا کالیلکر، پنڈت نہرو، میتھلی شرن گپت اور عبدالعلیم وغیرہ نے بھی اس کانفرنس میں تقریریں کیں اور ترقی پسند رجحان کی مقبولیت کا اعتراف کیا۔

الہ آباد کانفرنس کے بعد دیگر مقامات پر ترقی پسند مصنفوں کے اجلاس ہوتے رہے۔ جن میں کلکتہ اور دہلی اور حیدرآباد کی کانفرنسیں کافی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ حیدرآباد کی کانفرنس میں فحاشی کے خلاف ایک معاملہ اٹھا اور جو بحث ہوئی وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار اس کے لئے اب تک یاد کئے جاتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی جس کا اہم موضوع فرقہ پرستی اور فسادات تھے۔

مئی ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس ہوئی اور ۱۹۳۶ء کا منشور جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر پا رہا تھا رد کیا گیا اور نیا منشور بنایا گیا۔ اس وقت انسان

کی زندگی اور اس کی بقا کا اہم سوال درپیش تھا ہندوستان اور عالمی سیاست کو نظر میں رکھ کر ترقی پسند مصنفین کے لئے فرائض کا تعین کیا گیا۔

بھیمڑی کی کانفرنس نے ادیبوں اور شاعروں کو مختلف نظریات فکر میں تقسیم کر دیا تھا اور پھر سنہ ۱۹۵۲ء میں منشور پر نظر ثانی کی گئی اور پالیسی میں نرمی پیدا کی گئی۔ بلاشبہ ادبی تحریکوں میں یہ سب سے اہم تحریک ہے جس نے ہمارے ادب میں غیر معمولی تبدیلیاں کیں۔ اس تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں کہ :

"اس تحریک کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ادب میں زندگی کا تنقیدی احساس پیدا کیا اور قدروں کو جانچنے کے لئے ادب کو ایک سماجی معیار فن سے آشنا کیا۔ کیونکہ ترقی پسندی اور حقیقت نگاری میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے زبان عالمانہ تکلف سے ہٹ کر عامیانہ صفائی کی طرف مائل ہونے لگی"[1]

ترقی پسند تحریک نے اردو ادب پر اپنے گہرے اور ہمہ گیر اثرات مرتب کئے اور اردو کے مختلف اصناف ادب اس تحریک سے متاثر ہوئے لیکن خاص طور پر اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے بہت زیادہ اثرات پڑے اور اس تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں ایک کثیر سرمائے کا اضافہ ہوا شاعروں کی ایک پوری نسل جس میں جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، مخدومؔ، جذبیؔ، علی سردارؔ جعفری، فیضؔ، کیفیؔ اعظمی، جاں نثار اخترؔ، اختر انصاری، اختر الایمان، مجروحؔ، ساحرؔ، سلامؔ مچھلی شہری، علی جوادؔ زیدی، شمیمؔ کرہانی، رضیؔ عظیم آبادی، وقارؔ انبالوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں سامنے آئے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں نظم گوئی کو بڑا فروغ حاصل ہوا مستقل عنوانات پر مختصر اور طویل نظمیں لکھی گئیں اور اس نظم گوئی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کا اندازہ جگرؔ کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

ترقی پسند تحریک سے اردو شاعری میں مقصدی اور موضوعاتی نظموں کو اہمیت حاصل ہوئی

---

[1] "ادب اور انقلاب" از اختر حسین رائے پوری ص ۱۹

اس کے علاوہ ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت شعراء نے نظمیں کہیں جس کی وجہ سے ایک ہی
موضوع پر کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں ایسے
بہت سے نئے موضوعات اور مضامین بھی داخل ہوتے جو سے اردو شاعری پہلے آشنا نہیں تھی۔
جن موضوعات کو ترقی پسندی کے زیر اثر اردو شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہوئی ان میں
فاشزم کی مخالفت، اشتراکی نظام کی حمایت، انقلاب روس کا خیر مقدم، امن پسندی، آزادی
انقلاب، بغاوت، سرمایہ داری کی مخالفت اور سامراج دشمنی وغیرہ قابل ذکر ہیں جیسا کہ پہلے
لکھا جا چکا ہے کہ ترقی پسند تحریک کا مقصد ایک غیر طبقاتی نظام اور معاشرے کی تشکیل تھا چنانچہ
اس مقصد کے تحت اردو شاعری میں انقلاب پسندی اور حقیقت نگاری کے رجحان کو بڑی مقبولیت
حاصل ہوئی۔ انقلاب پسندی کے رجحان کے تحت اردو شاعری میں ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئیں
جس میں بغاوت کا پیغام دیا گیا تھا مجاز کی نظم "انقلاب" جاں نثار اختر کی نظم "ساقی"، سردار
جعفری کی نظم "جوانی"، وقار انبالوی کی نظم "انتقام" اور معین احسن جذبی کی نظم "دعوت انقلاب"
اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

انقلابی رجحان کے تحت غلامی کے خلاف سامراج کی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے
خلاف اور آزادی کے موضوعات پر بھی بے حساب نظمیں کہی گئیں۔ حقیقت نگاری کے تحت
ترقی پسندوں نے اپنی نظموں میں عام انسانی زندگی کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ عام انسانی زندگی
کے مسائل اور نچلے و غریب طبقے کے دکھ درد، پریشانیوں اور مصیبتوں کی بھی بھرپور ترجمانی کی
ہے اور ان کے اسباب کو بھی بے نقاب حالت میں پیش کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کے لئے
موضوعات کی بے حد فراوانی ہو گئی۔ اتنا ہی نہیں ترقی پسند شعراء نے اپنی تخلیقات میں انسان کی
عظمت کے گیت گائے انسان دوستی کا پیغام دیا، آزادی کے نغمے الاپے، وطن پرستی کے جذبے کو
ابھارا اجتماعی جد و جہد عمل کی تلقین کی، روشن مستقبل کے خواب بنے۔ اس ذیل میں رضی عظیم آبادی
کی "نوجوان کی دنیا"، شمیم کرہانی کی "قومی سپاہی کا گیت"، "جواں جذبہ ہے" کے علاوہ شہاب
ملیح آبادی کی "ہمت آنکھیں ہے مرد انقلاب" وغیرہ نظمیں نہایت مقبول ہوئیں۔ اس وقت ترقی پسند
شاعروں کا ایک موضوع رجعت پسندی کے خلاف بھی آواز بلند کرنا تھا وہ تقلید پسندی اور
قدامت پرستی کی مذمت بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے قدیم رسم و رواج، توہم پرستی، قدامت اور
تقلید پسندی کی مخالفت بھی کی اور مذہب کی غیر ضروری رسموں کو بھی توڑنے کا پیغام دیا۔ اس تحریک

کے پیش نظر اشتراکی نقطۂ نظر کی تائید اور ترجمانی کے علاوہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور محنت کی غیر منصفانہ اجرت کو بھی شاعری کا موضوع قرار دیا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں محبت اور محبوب کا ایک تقریباً نیا تصور سامنے آیا۔ اس تحریک سے محبت کار بے کاراں اور محبوب ظلم و ستم کا پیکر بنا ہوا تھا اور شاعر کی پوری توجہ اس کے حسن و جمال کے فرضی راگ الاپنے پر مرکوز تھی۔ ترقی پسند شاعر نے محبوب کو غمگسار، دوست، ہمدرد اور رفیق کے روپ میں پیش کیا اور محبت کے جذبے کی گرمی سے سماجی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے اور صحت مند ماحول کو پیدا کرنے میں مدد لی، عشق سے کارزار حیات میں قوت و حوصلہ حاصل کیا۔ مجاز، فیض، مخدوم، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، سلام مچھلی شہری، جذبی اور مسعود اختر جمال وغیرہ کی بہت سی نظمیں اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے شاعری کے اظہار و زبان و بیان کے پیرایوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے نقطۂ نظر کی ہم آہنگی اور وحدت کے تقاضے کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر مختلف شعراء نے علیحدہ علیحدہ نظمیں کہیں اور اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے انداز بیان کے نئے نئے پیرائے اختراع اور ایجاد کئے جس سے اسالیب بیان میں تنوع و رنگا رنگی پیدا ہوئی اور بہت سے بیانیہ انداز مقبول ہوئے ترقی پسند موضوعات کے مخاطب عوام ہوتے تھے اس لئے زبان میں عوامی الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا گیا شاعری میں آسان و عام فہم الفاظ کے استعمال کا رجحان بھی فروغ پایا اور اس طرح زبان کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا۔ غرض یہ کہ مجموعی طور پر ترقی پسند تحریک اردو شاعری کے لئے نیک فال ثابت ہوئی اس کے ذریعہ نہ صرف اردو شاعری کا موضوعاتی ذخیرہ وسیع ہوا بلکہ اردو نظم کے اسالیب اور ہیئتوں کے اعتبار سے بھی نت نئے امکانات روشن ہوئے۔

اردو شعر و ادب میں ترقی پسندانہ نظریہ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم جوش کی شاعری کے موضوعات ان کے انداز بیان اور لب و لہجہ پر نظر ڈالتے ہیں تو جوش ہمیں کافی اہم دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی تحریک سے قبل ہی جوش نے اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی اور وہ ایک خالص نظم گو کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے لیکن ان کی بالغ نظر نے مستقبل کے اس زمانے کی دھمک محسوس کر لی تھی جس کے جلو میں انقلاب کی گونج اور ایک نئے دور کا سراغ تھا۔ جوش کی ۱۹۳۶ء سے قبل کی نظموں سے یہ صاف واضح ہے کہ جو کام پریم چند

افسانوی ادب کے ذریعہ انجام دے رہے تھے۔ جوشؔ نے اپنی شاعری میں اسے مقام دیا۔ پریم چند فکر و فن کے لحاظ سے مقصدی تھے۔ حقیقت پسندی ان کے خمیر میں تھی اور اقتصادی اور سماجی تبدیلی کے زبردست خواہاں تھے۔ جوشؔ کی حقیقت پسندی، مقصدیت اور انقلاب کی نعرہ بندی ان کے اجتہادی ذہن کی دلیل ہے چونکہ پریم چند کا تعلق نثر سے تھا اس لئے ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع تھا۔ جب کہ جوشؔ کے موضوعات مخصوص تھے۔ مخصوص ہونے کے باوجود شاعری کے لئے وہ نامانوس تھے۔ جوشؔ کی قادر الکلامی کا معجزہ تھا انھوں نے غیر شاعرانہ موضوعات کو بڑی خوبی کے ساتھ شاعرانہ بنا دیا۔ اور وہ مانوس نظر آتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حالیؔ، اسمٰعیل میرٹھی، آزادؔ اور شبلیؔ کی نظموں نے جوشؔ کے لئے پہلے سے ایک فضا تیار کر دی تھی۔ جوشؔ کے سرگرم جذبے نے ابتداء ہی سے دنیا اور بالخصوص غلام ہندوستان کے زخموں کو محسوس کر لیا تھا۔

اس لئے ان کی نظموں میں جو تڑپ، سرگرمی، جوش اور جذبہ موجزن ہے اس کی جھلک ان کے پیش روؤں میں کہیں نہیں ملتی ان نظموں میں احتجاج کی لے واضح اور غصہ وری نمایاں ہے۔ ایسی نظموں میں "حالات حاضرہ"۔ "شکست زنداں کا خواب"۔ "دام فریب"۔ "زنداں کا گیت"۔ "ہوشیار"۔ "خونی بنیئے"۔ "ہم لوگ"۔ "خریدار توبہ"۔ "گرمی اور دیہاتی بازار"۔ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں جوشؔ نے آزادی، انقلاب، بغاوت اور حقیقت کی بھرپور ترجمانی کی ہے انھیں موضوعات کو ترقی پسند مصنفین نے بہت بعد میں اپنایا تھا۔ اس لئے اگر جوشؔ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ اردو شاعری میں ترقی پسندوں کے پیش رو ہیں تو نامناسب نہ ہوگا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیال کے مطابق کچھ ادیبوں کی نشو و نما ترقی پسند تحریک سے پہلے ہو چکی تھی ان میں جوشؔ بھی ہیں وہ لکھتے ہیں:

"جن کے شعور اور شخصیت کی نشو و نما ترقی پسند تحریک سے پہلے ہو چکی تھی مثال کے طور پر پریم چند، قاضی عبد الغفار، جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری وغیرہ ........ یہ لوگ دراصل ترقی پسند تحریک کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔"[1]

جوشؔ ترقی پسند تحریک کے پیش رو ہیں اور ان کی اس سالاری کا ناقدین ادب

---

[1] اردو میں ترقی پسند تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۵

نے اعتراف کیا ہے کیونکہ اس تحریک سے قبل ہی جوش نے ان ترقی پسندانہ موضوعات کو کامیابی سے اپنا کر برت لیا تھا اور اپنی شاعری میں پیش کر چکے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند تحریک کی سالاری بعد کی چیز ہے۔ اس نوع کے جذبات جوش کے یہاں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے دس پندرہ برس پہلے یعنی سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء سے ملنے لگے تھے۔ "انسان کا ترانہ"، "باغی انسان"، "پست قوم"، "جھریاں"، "مہاجن اور مفلس"، "ضعیفہ"، "نیبو کا ہندوستان"، "ہماری سوسائٹی" اور اس طرح کی دوسری نظموں میں جوش نے برصغیر کے عوامی دکھ، درد، افلاس، ناداری اور جہالت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کی غیرت کو للکارا ہے۔" [1]

"حالات حاضرۂ" جو پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں لکھی گئی تھی اس نظم میں جوش ہندوستانی حالات سے عوام کو آگاہ کرتے ہوئے جنگ کے نقصانات بھی بتاتے ہیں۔ ہندوستان میں جو قحط اور اس کی وجہ سے بھکمری اور بیماری پھیل رہی تھی ان کا ذکر کرتے ہیں اور جنگ کو اس نحوست کا سبب بتاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تجارت کی جگہ لوگ گداگری اختیار کر لیتے ہیں۔ چمن میں پھولوں پر شبنم کی نمی مفقود ہو جاتی ہے اور یہیں کے عوام شام اودھ اور صبح بنارس سے محظوظ نہیں ہو سکتے اس کا احساس دلاتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

ہر چیز پر سکوت ہے ہر شے پہ یاس ہے
غم حکمراں ہے دہر میں دنیا اداس ہے
یہ جنگ کیا ہے ایک مجسّم جنون ہے
گلزار کائنات کے شانوں میں خون ہے

یہ نظم جوش کی حقیقت پسندی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جوش کی ایک اور نظم "شکستِ زنداں کا خواب" جو کہ سنہ ۱۹۲۱ء لکھی گئی تھی۔ جوش کی سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ اور عالی ہمتی کی مثال ہے۔ اس نظم میں جوش نے ہندوستان کو ایک قید خانے کی شکل میں

---

[1] شاعریت و فطرت جوش ملیح آبادی۔ دو ماہی "الفاظ" اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء ص ۱

پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس قید خانے کے قیدی اب انقلاب برپا کرنے والے ہیں
وہ لگتے ہونے لگے ہیں وہ اب قید کی زندگی سے اکتا چکے ہیں اور غصے میں بے قابو ہونے لگے
ہیں۔ بادشاہِ وقت کا چہرہ ان کی اس کیفیت سے خشک ہوتا نظر آرہا ہے۔ جوش اس
نظم میں خطاب کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
ایک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب دیس غلام تھا اور غلامی بھی کیسی جب اس کا اظہار بھی
جرم تھا۔ جوش کا یہ ایک بڑا جراُت مندانہ قدم تھا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ایک جگہ لکھا ہے

"اگر شکستِ زنداں کا خواب" ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی ہے تو جوش کی
سیاسی سوجھ بوجھ اور ہمت کی داد دینی پڑے گی "[1]

سردار جعفری عزیز احمد کے حوالے سے اس نظم کی پرشوکت روانی کو زلزلہ خیز بتاتے ہیں
انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ انھیں صاف سنائی دیتی ہے جس سے پوری نسل ان کے
خیالات سے متاثر ہوتی نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میں اس نظم کی تعریف میں اس سے بہتر الفاظ استعمال نہیں کرسکتا جو عزیز احمد
نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں استعمال کئے ہیں۔ ان کے تشبیہات و استعارات میں
آتشِ سیال کا ابال اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ ان استعارات کی جدت اور ندرت
متحرک اور زلزلہ خیز ہے۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ ایسی نظموں کی پرشوکت روانی ان کے
وزن ان کے الفاظ کی بے محابا ترتیب ان کے جذبات کی خودسری میں انقلاب
کے آہنی قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی ہے: اس طرح کی نظموں نے اردو میں
ایک نئے قسم کی متحرک دلولہ خیز اور مجاہدانہ MILTANT شاعری کی بنیاد ڈالی
ہے جس کا اثر ترقی پسند شاعروں کی پوری نسل پر پڑا ہے" [2]

حقیقت نگاری کی مثالوں کے لئے بہت سی نظموں کو پیش کرسکتے ہیں فریدار نو جن میں

---

[1] "جوش کی انقلابی شاعری کا مطالعہ" در ماہی "الفاظ" اکتوبر ۱۹۷۹ء ص ۲۳

[2] "ترقی پسند ادب" از سردار جعفری ص ۱۵۱

انھوں نے آزادی کی خواہش کا اظہار اور ملک کے عوام کی توجہ آزادی کامل کی طرف منعطف کراتی ہے وہ کہتے ہیں۔

اے دلِ آزادیٔ کامل کا سزاوار تو بن
پہلے اس کاکلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ایک نظم "دام فریب" لکھ کر اپنے قلبی تاثرات پیش کیے سنہ ۱۹۳۱ء میں "زنداں کا گیت" لکھ کر قفس کی کروٹوں میں طوفان کی آمد کی اطلاع اور آزادی کی شدید خواہش کا کھلا اظہار کیا اسی طرح نظم "ہوشیار" میں ملک کے مزدوروں کو سرمایہ داری کے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس ذیل کی ایک اور نظم "کسان" جو سنہ ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی تھی اس نظم میں وہ کسان کو ارتقا کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار قرار دیتے ہوئے اس کی زبوں حالی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے ہل کی بھی ان لفظوں میں تعریف کرتے ہیں۔

کون ہل ظلمت شکن قندیلِ بزم آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ سینۂ گیتی کا دل

وہ کسان کے گھر کی حالت بیان کرتے ہوئے بیوی کی اداسی اور بچوں کی فاقہ کشی اور مفلسی کا اثر انگیز پیرائے میں احساس کراتے ہیں اور اس کو سنبھل جانے کے لئے کہتے ہیں۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرِ اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

ایک اور نظم "لمحۂ آزادی" میں جو انھوں نے سنہ ۱۹۳۱ء میں لکھی تھی غلامی سے اپنی نفرت کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

آزادی کی ایک پل کو غلامی کی حیات جاوداں پر ترجیح دے کر جوش نے بجا طور پر آزادی اور غلامی کے فرق کو واضح کر دیا تھا۔ ان نظموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جوش کی نظموں میں انقلاب، بغاوت، آزادی، امن اور حقیقت کی تصویر کشی جیسے مضامین ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی منظر آ چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد یہ مضامین اور طاقتور ہو کر بکھرے ہیں ان کی اس دور کی ایک اہم اور مقبول نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں

کے نام" کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ ترقی پسند ادب کے فن پاروں میں اس سے زیادہ مقبول کوئی اور نظم نہیں ہو سکی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ نظم آج بھی اتنا ہی اثر پڑھنے والے پر طاری کرتی ہے دیکھئے نظم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگر و
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

---

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

پھر وہ انگریزوں کو ان کے ظلم بے نہایت اور کمپنی سرکار کی مجرمانہ حرکات دست کاروں کے انگوٹھے کاٹ دیئے اور ہندوستان کی صنعت کو تباہ برباد کر دینے کی سازش کا حوالہ دیتے ہیں انھیں یاد دلاتے ہیں کہ اودھ کی بیگموں اور مہارانی جھانسی کے ساتھ تم نے کیا سلوک روا رکھے تھے اور سراج، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کی گئی ظالمانہ حرکتیں بھی تمہیں یاد ہیں مجاہدین آزادی کو تم نے کس طرح کچلا تھا بھگت اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی پھانسیاں بھی تمہیں یاد ہیں اور قید خانوں کے ظلم و ستم بھی کیا تم بھول گئے ہو آخر میں کہتے ہیں کہ وقت کا فرمان تمہارے خلاف جاری ہو چکا ہے اب اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔

ایک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

اور

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

اس جرأت اور بے باکی سے ایوان حکومت لرز اٹھا جوش کی یہ نظم ضبط کر لی گئی اور اس کی اشاعت بھی جرم قرار دی گئی اس سلسلے میں ان کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی جس سے متاثر ہو کر جوش نے ایک نظم "تلاشی" لکھی جس میں لکھا کہ تلاشی اور لوں کی لی جائے ہمارے دلوں میں

کتنی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا اندازہ تم کرنے کی کوشش کرو وہ کہتے ہیں۔

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کر بر آئے مراد
جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے ان میز کے خانوں میں ہے

"تلاشی" کے بعد ان کے قلم نے اور بھی شعلہ انگیز نظمیں لکھیں جن میں ترقی پسندی کے اشارات صاف طور پر نظر آتے ہیں اشتراکیت کی جانب ان کے رجحان کا بھی ان نظموں سے اندازہ ہو جاتا ہے آزادی وطن کی خاطر جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی عام طور پر پسند کی جاتی رہی ہیں اور آزادی حاصل ہونے کے بعد جو فسادات، آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی اس پر بھی جوش نے نظم لکھی "مقتل کانپور" میں فسادات کے بھیانک انجام کی منظر کشی کی اور احساس دلایا کہ یہ کتنے جان لیوا ہیں۔

مذہب کے اندھے رسم و رواج پر بھی جوش نے ضرب پر وار کئے اور محض اوہام کے سہارے جو باتیں مذہب میں داخل کر لی گئیں۔ ان کے خلاف بھی آواز بلند کی "حسین اور انقلاب" "مولوی" "فتنہ خانقاہ" اور "ذاکر سے خطاب" وغیرہ خاص طور پر اس ذیل میں قابل ذکر ہیں جوش نے مذہبی عقیدت سے جو لوگ فائدہ اٹھا کر مذہب کے بزعم خود ٹھیکیدار بن بیٹھے ہیں ان کا پردہ چاک کیا اور مذہب کی صحیح روح اور جذبہ کی طرف متوجہ کیا۔ "ذاکر سے خطاب" میں دو عملی پالیسی پر عمل پیرا پیشہ ور ذاکر کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ یہ نظم مذہب کے نام پر دولت کمانے والے ذاکر کی اصلیت کو بے نقاب کر دیتی ہے اس نظم میں وہ کہتے ہیں۔

سوچ تو اے ذاکر افسردہ طبع و نرم خو
آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پر تیری گفتگو
عالم اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خون اہل بیت سے لقمے کو تر کرتا ہے تو

ان نظموں کے علاوہ آزادی، مساوات، اخوت، بغاوت، انقلاب اور زندگی کے تلخ حقائق پر ان کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں "نظام نو" "بیدار کر" "بغاوت" "نا خدا کہاں ہے"

"سلام"، "بیدار ہو"، "بیداری" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انگریزی استعماریت کے خلاف "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" کے علاوہ "وفادارانِ[6] ازلی کا پیغام شہنشاہِ ہندوستان کے نام"، "فردا"، "انقلاب کی آواز"، "زندہ مردے" نظمیں کافی اہم ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے اپنے لئے موضوعات ہندوستان اور اس کے عوام کے مسائل، ان کی زندگی اور فلاح و بہبود کے عزائم پر مبنی منتخب کئے تھے جوش نے بھی یہاں کے عوام کے دکھ درد اپنی نظموں میں پیش کئے انھوں نے "ترانۂ آزادیٔ وطن" لکھ کر آزادی کا بڑا والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا۔ وہ کہتے ہیں۔

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے اٹھو کہ نو بہار ہے

نشانِ دولتِ وطن مچل رہا ہے چرخ پر — دمک رہے ہیں بام و در جھلک رہے ہیں بحر و بر
چمک رہی ہے زندگی چھلک رہا ہے جامِ زر — چلیں نہ رند کس لئے طرب میں سینہ تان کر

کہ آج طرفہ جیت کا گلے میں تازہ ہار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے اٹھو کہ نو بہار ہے

اس ترانۂ آزادی کی پہلی آواز میں وہ جہاں بہار ہی بہار کا ذکر کرتے ہیں وہیں دوسری آواز ان کے دل و دماغ سے نکلتی ہے :-

جنون و جبر و جنگ ہے جہاد و جور و قہر ہے — جدال گاؤں گاؤں ہے قتال شہر شہر ہے
سپاہیوں کی موج ہے تباہیوں کی لہر ہے — ہوا میں جوئے مرگ ہے فضا میں بوئے زہر ہے

کماں میں تیرِ شحنہ ہے کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

آگے بڑھ کر وہ ملکی حالات کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

یہ قتلیں، یہ رشوتیں، یہ پگڑیاں یہ چوریاں — یہ شرمناک چوریاں اور اس پہ سینہ زوریاں
سبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں — ادھر خلا ہے پیٹ میں ادھر بھری ہیں بوریاں

ادھر گل و نسیم ہے ادھر سموم و خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

اور آخر میں پھر تیسری آواز کے ذریعہ وہ ان حالات سے مایوس ہونے کے بجائے پر امید

ہو کر حالات کو سازگار بنانے کے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے نغمہ زن ہو جاتے ہیں۔

بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے

میاں یہ وقتِ جشن ہے بیا بھرے خانہ
محلِ رقص و وجد ہے کہ رات تو پا لیا

فضا سے ابر چھٹ گیا ہوا کا رخ بدل گیا
جو دل میں ہے حسینیت تو کیا بلا ہے کربلا

وہ کل بنے گا بوستاں جو آج خارزار ہے

بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے

وہ ملک اور قوم کو ایک نیا ولولہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

جو زندہ ہیں تو اس زمیں کو آسماں بنائیں گے
اجل کو قصرِ زندگی کا پاسباں بنائیں گے

خود آندھیوں کو طاقِ شمعِ زرفشاں بنائیں گے
بجائے شاخ برق پر خود آشیاں بنائیں گے

کہ دوشِ برق و باد پر بہشت لالہ زار ہے

بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے

جوشؔ مستانہ وار جھومتے ہوئے نغمہ زن ہیں۔ ان کے تیور دیکھئے:

ارے بتاؤ کون ہے یہ زندگی کا نغمہ خواں
یہ کس کی زندہ گونج سے لرز رہا ہے آسماں

یہ کس کا حرف گرم ہے ستارہ بار و ضوفشاں
ارے یہ کون بھر رہا ہے ولولوں کی بجلیاں

یہ شاعرِ حیات ہے یہ جوشؔ بادہ خوار ہے

بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے

جوشؔ نے جب ملکی حالات آزادی کے بعد بھی ناگفتہ بہ دیکھے تو پھر ایک نظم "ماتمِ آزادی" لکھ کر ساری خامیوں اور خرابیوں کو اس میں سمیٹ لیا اور لکھا۔

دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے

صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے

اترا جو بار اور گراں بار ہو گئے

آزادیوں بڑھے کہ گرفتار ہو گئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں سنگ ہو گئی

یوں پو پھٹی کہ صبح بھی دنگ ہو گئی

ملک کے ان مسائل پر جوشؔ نے "رشوت"، "نہ پوچھ"، "اے نوعِ بشر جاگ"، "فردوس آدم"

اور "لافانی حروف" وغیرہ بے شمار نظمیں لکھیں جنھیں پڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ کی نظمیں اور ان کی شاعری ترقی پسند ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہیں جیساکہ سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھا ہے۔

"جوشؔ براہ راست سیدھی، سادی ایجی ٹیشنل شاعری سے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف قوم کو ابھارتے ہیں۔ ان تمام رجعت پرست اداروں کا پول کھول دیتے ہیں جن کی وجہ سے آزادی کی تحریک کمزور ہوتی ہے اور شہنشاہیت کو سہارا ملتا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ جہالت، وہم پرستی، مذہبی جنون روایتی اخلاق کی زنجیروں کو توڑنے کی ترغیب دیتے ہیں اور ان راحتوں اور لذتوں کو سراہتے ہیں جنھیں صدیوں کے جبر و ظلم اور تشدد بھی نہ مٹا سکے وہ اپنی وطنی اور قومی نظموں میں ہمارے ملک کے شام و سحر، اس کے پہاڑوں دریاؤں، جاڑوں، گرمیوں اور برساتوں کا حسن بیان کرتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کی قوت صلابت حسن اور نزاکت کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں ان نظموں کو پڑھ کر ہندوستان سے اور اپنی قوم سے اپنے تہذیب و تمدن سے اپنے ادب اور فن سے ہماری محبت بڑھ جاتی ہے یہ جوشؔ کا کارنامہ ہے جس نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا اور مقبول شاعر بنا دیا ہے ترقی پسند تحریک کے شاعر جوشؔ کے اسی ورثے کو لے کر ہی شاعری کر رہے ہیں۔"

سردار جعفری کی طرح اور بھی ناقدین ادب نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جوشؔ نے اپنے زمانے کے مسائل کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ ترقی پسندوں کے پیش رو کی حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ترقی پسندوں نے اگر کسی کو آخری وقت تک قبلۂ رندان جہاں تسلیم کیا ہے تو وہ صرف جوشؔ ہیں۔ فیض احمد فیض نے غالباً ۱۹۴۲ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ۔

"افادی اعتبار سے جوشؔ کے کلام کی قدر و قیمت میں کلام نہیں کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرأت اور دلیری چاہتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں اس احتجاج کی وقعت مختلف وجوہات کے سبب اور بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جوشؔ کی مثال نے

بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اور انھیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اگر ان میں بہت سے ناکام اور بے رنگ نقالی کی حد سے آگے نہیں گزر سکے تو اس کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہے جو گنتی کے چند لکھنے والے ہمارے نئے ادب میں تھوڑا بہت اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھیں جوش کی رفاقت اور گرمیِ گفتار سے یقیناً اعانت اور امداد ملی ہے۔"

# جوش کا شاعرانہ کمال

جوش ملیح آبادی کا نام اردو شعر و ادب میں ایک بلند مرتبہ کا مالک ہے۔ جدید شاعری میں جوش نے کئی اہم اضافے کئے ہیں۔ جہاں انھوں نے ماضی کی عظیم شعری روایات سے روشنی حاصل کی ہے وہاں جا بجا روایت شکنی سے بھی کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ تنوع اور رنگا رنگی کا پہلو ان کی شاعری میں بہت نمایاں نظر آتا ہے انھوں نے بعض دشوار اہم اور قطعی نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ وہ انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کے ترجمان ہیں انھوں نے بعض بہت ہی چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں کو بھی اپنی شاعری کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور بعض ہنگامی موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے ان کی شاعری میں ان کی نجی زندگی اور اس عہد کی اجتماعی زندگی دونوں ہم آہنگ ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری زندگی سے قریب تر اور رنگین ہو گئی ہے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر حنیف فوق لکھتے ہیں کہ

> "جوش کی شاعرانہ عظمت اس امر میں ہے کہ ان کی شاعری کا ہر پہلو کیف و رنگینی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے پھیلے ہوئے سلسلوں سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہے مجموعی طور پر ان کی شاعری اپنے دور کی اہم تہذیبی منزل کہی جا سکتی ہے جہاں سے آگے بڑھنے کے بے شمار راستے نکل آتے ہیں اس منزل تک پہنچے بغیر تہذیب کے لئے اپنے ارتقائی سفر کو جاری رکھنا مشکل تھا۔"[1]

---

1۔ جوش کا آہنگ شاعری، ماہنامہ افکار، کراچی، جوش نمبر [illegible]

جوشؔ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کسی ایک فلسفے کو پیش نہیں کیا بلکہ مختلف النوع موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور فلسفیانہ پہلو کو بھی ملحوظ رکھا اور ہیئت میں بھی کئی نئے تجربات کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تنوع، وسعت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ جوشؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا صنف غزل کی نکتہ چینی کے باوجود وہ غزل سے دامن نہیں بچا سکے ان کی غزلوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ نے لکھنؤ کے انداز بیان سے استفادہ تو کیا مگر اس کے مرید نہیں بنے غزلوں میں انھوں نے روایت کے مطابق حسن وعشق کو موضوع بنایا مگر اسے ایک نئے انداز سے پیش کیا ان کی غزلوں میں تجربے اور مشاہدے نے ایک جدت کی کیفیت پیدا کر دی ہے جس میں زندگی اور جولانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں روایت کا بھرپور احترام ہے وہیں اپنی راہ خود نکالنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے انھوں نے اپنے آپ میں ڈوب کر غزلیں کہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں درویشی اور سکینی نہیں رنگینی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے حسن اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیٔ بازار نہ ہوتا

---

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا

---

اٹھا کے ناز سے شب آفریں نگاہوں کو
کسی کی سوئی ہوئی روح کو جگاتا جا

---

ثبوت یہ ہے محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا ہم نے اعتبار کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

ان اشعار میں حسن وعشق کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر حسن وعشق کے موضوعات میں شاعر کھو نہیں گیا ہے بلکہ اسے حسن سے زیادہ عشق کا احساس ہے اور یہی احساس جوش کی غزل گوئی کی خوبی بھی ہے اس میں جہاں شبابِ رفتہ کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے وہاں دوسری طرف عہدِ شوق کی کہانیوں کا لطف بھی ملتا ہے یہ ان کی غزل گوئی کا خاص مزاج ہے ان کی غزلوں میں جدت کا احساس ہمیشہ برقرار رہتا ہے جس میں ان کی بڑائی کا راز مضمر ہے انھیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ ان کی غزلیں فارسی غزلوں سے کسی قدر کم نہیں زیادہ لکھتے ہیں۔

آج اے جوش تیرے رنگ غزل گوئی سے
قندِ پارس کا مزہ ہے یہ زبان اردو

غزل کے علاوہ جوش نے صنف رباعی پر طبع آزمائی کی بحیثیت رباعی نگار کے بھی جوش کا ایک اہم مقام ہے انھوں نے رباعیات بڑی تعداد میں لکھی ہیں اور اس صنف کو بہ اعتبار موضوعات وسیع کیا ہے جوش کے رومانوی مزاج کی جھلک ہمیں ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے جمالیاتی احساس کا عنصر ان کی رباعیوں میں بھی دکھائی دیتا ہے رباعیات میں جوش نے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ ایک نئے آہنگ سے اردو رباعی کو روشناس کرایا نظم کے بعد اگر جوش نے کسی صنف پر توجہ دی تو وہ صنف رباعی پر ہی دی ہے ان کی رباعیوں میں تمام مضامین کی اعلیٰ مثالیں مل جاتی ہیں جوش کی رباعیات کے موضوعات میں تجرباتِ عشق، فلسفہ، علم وعقل، غم وخوشی، سیاسی، سماجی، اخلاقی، خودی وبےخودی، جبر واختیار، فنا وپیری وغیرہ اہم ہیں۔ مگر ان سب موضوعات میں خمریہ رنگ نمایاں ہے۔ ان کی رباعیوں میں ہمیں ان کے عہد سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے کیونکہ ان کی رباعیوں میں اس وقت کے حالات کا بھرپور پرتو نظر آتا ہے اور اس عہد کے نظام پر ضرب کاری بھی، وہ ہر مقام پر عظمتِ انسانی کے قائل ہیں اور آدمی کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں؛

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے　　آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تجھ کو　　اے شدتِ غم پہ مسکرانے والے

ایک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا
ایک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو پلٹے تو کھلا
ایک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

جوشؔ نے اپنے زمانے کے حالات کو بھی اپنی رباعیات کا موضوع بنایا ہے حسن و عشق تو ان کا محبوب موضوع ہے ہی اس کے ساتھ رباعیات میں انھوں نے فطری مناظر کو ہم آہنگ کر کے بھی پیش کیا ہے ان کی رباعیوں میں تفکر کی اعلیٰ مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں ڈاکٹر فضل امام ان کی رباعی نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جوشؔ کی رباعیوں نے اردو شعرا کو نئی راہ دکھلائی اس صدی میں جوشؔ سے بڑا اردو شاعری میں کوئی رباعی نگار شاعر نہیں ہو سکا ہے انھوں نے اپنی فطری ذہانت سے اس صنف سخن کو دلچسپ اور دل کش عناوین سے روشناس کرایا ان کی رباعیاں اردو شاعری کا لازوال سرمایہ ہیں۔" [1]

دراصل رباعی بڑی سخت صنف سخن ہے اس بیسویں صدی میں طبع آزمائی کرنے والوں میں تو کئی شاعر ہیں مگر مقبولیت صرف فراقؔ اور جوشؔ کو حاصل ہوئی۔ ادبی حیثیت سے فراقؔ کا مجموعہ "روپ" بھی جوشؔ کی رباعیوں کے سامنے پھیکا نظر آتا ہے۔ جوشؔ نے نظم کے بعد سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رباعی ہی کو قرار دیا اور اس میں اپنا ایک منفرد اعلیٰ مقام بنا لیا۔

جوشؔ کی شاعری کے اصل جوہر ان کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں انھوں نے نظموں میں اپنی فن کاری کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے رومانی نظمیں بھی لکھیں اور انقلابی نظمیں بھی، زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ان کی نظر سے بچا ہو عشق اور حسن تو ان کے خاص موضوع ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی ان کی نظموں میں مناظر فطرت کی بہترین عکاسی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسن کا بیان کرتے وقت حسن کے ہر پہلو کو ملحوظ رکھا ہے اور حسن کو بھی وہ پر شباب حالت میں پسند کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں شباب کی وجہ سے عشق اور عشق کی وجہ سے شباب کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ شباب اور عشق کی ہم آہنگی

---

[1] "شاعر آخرالزماں جوشؔ ملیح آبادی" از ڈاکٹر فضل امام ص ۱۱۱

کی وجہ سے ان کی شاعری میں رنگینی اور کیف آگیں کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ معاملات عشق
کا بیان وہ بڑے دل موہ لینے والے انداز سے کرتے ہیں "روح ادب"۔ "الہام و افکار" تک ان کا
شاید ہی کوئی مجموعہ ہو جس میں حسن و عشق کا بیان نہ ملے یہ موضوع ان کے مزاج کا عنصر ہے
ان کے نزدیک بغیر عشق انسان کی تکمیل نہیں ہوتی ہے ان کے اس قسم کے مزاج میں کچھ تو
شام اودھ اور کچھ ان کے کامیاب معاشقے ہیں جن کی وجہ سے وہ شاعری کی دنیا میں بھی کامیاب
عاشق کی طرح نظر آتے ہیں۔

فطری مناظر کو بھی جوش نے بڑے حسین انداز سے پیش کیا ہے ویسے تو قدرتی مناظر
حسین ہوتے ہی ہیں۔ مگر جوش کا کمال یہ ہے کہ الفاظ سے حسین نظارے کو حسین تر بنا دیا
ہے مناظر فطرت کو مختلف انداز سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہوئے انھیں اس بات
کا بھی یقین سا تھا کہ وہ فطرت کی برنائیوں کی مکمل نقاب کشائی نہیں کر سکے ہیں کیونکہ
فطرت کا حسن تو اس کے خالق کی صناعی ہے پھر بھی جوش نے اپنی نظموں میں فطرت کے
حسن کو شاعرانہ کمال کا مرقع بنا کر پیش کیا اور انھیں اعلیٰ ادبی مقام دلایا ہے۔

جوش نے انسانی جذبات کی ترجمانی بھی اپنی نظموں میں کی ہے۔ ان کی نظموں میں
جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں چاہے ان کا موضوع کچھ بھی ہو جذبات ان کے ہر موضوع
پر حاوی ہیں قومی تحریک سے وابستگی اور جذبات کی شدت کی وجہ سے ہی وہ "کمینہ" "روسیاہ"
"بے حیا" جیسے الفاظ کا استعمال بھی کر ڈالتے ہیں جوش جذبات سے بے قابو ہو کر غیض و
غضب کا مظاہرہ بھی گھن گرج سے کرتے ہیں۔

جوش نے اپنی شاعری میں انقلاب کے گیت بھی گائے ہیں وہ فطرتاً رومانوی مزاج کے
شاعر ہیں مگر فرد کی آزادی اور وہ بھی آزادی کامل کے شدت سے خواہشمند ہیں یہی وجہ
ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں قومی تحریک کو تقویت پہنچانے کی کامیاب کوششیں بھی
کی ہیں۔ جوش کے نزدیک غلامی انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے اور غلام انسان
اپنی تکمیل نہیں کر سکتا ہے وہ غلام انسان کو انسان ماننے سے انکار کرتے ہیں حصولِ آزادی
سے پہلے آزادی کی تمنا کا اظہار جس طرح جوش نے کیا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر
عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

خیالات و واقعات اور فضا و ماحول کے تقاضوں سے اپنی شاعری

میں انقلابی رنگ دیا اور اس طرح وہ زندگی بھر انقلاب کے گیت گاتے رہے
اس نظام کو بدلنے کا پیغام دیتے رہے انھوں نے رومانیت کے ساتھ ساتھ
مزدور اور کسان کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے عوام کی زبوں حالیوں
کے نقشے کھینچے ہیں بدلتی ہوئی زندگی کی تصویریں بنائی ہیں۔" [1]

جوش کا سرمایہ کلام اتنا وافر ہے کہ اس کو موضوعات کے خانوں میں آسانی سے بانٹا بھی نہیں جاسکتا ہے کیونکہ ان کی نظموں میں کسی خاص چھاپ کا ملنا دشوار ہے ان کی نظمیں کسی ایک دائرۂ فکر سے بندھی ہوئی بھی نہیں ہیں اگر ہم کسی نظم کو انقلابی کہیں تو اس میں بھی رومانوی عنصر ملتا ہے یا کسی اور نظریہ فکر کا احساس نمایاں ہونے لگتا ہے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جوش نے آزادی کے ترانے والہانہ انداز میں گائے ہیں فطرت کے وہ پرستار تھے جذبات کی شدت ان کے کلام میں بھرپور ہے حسن و عشق ان کے عزیز ترین موضوعات رہے ہیں اس کے علاوہ ان کی شاعری کی عظمت ان کے ذخیرۂ الفاظ کے بے پناہ استعمال سے بڑھی ہے انگریزی زبان کے ایک اہم ترین شاعر کولرج نے ایک مرتبہ فن شاعری سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاعری وہی ہے جس میں بہترین الفاظ کو بہترین طریقہ سے نظم بند کر دیا گیا ہو۔ جوش کو بھی الفاظ پر قدرت حاصل تھی اور ان کی نظموں کا مجموعی جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ ان کی دہلیز پر ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں اسی لئے ایک جگہ وہ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں۔

"الفاظ کو کاغذی روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو وہ تو بے جان لکیریں
ہیں نہ ہوا کی گرہیں الفاظ تو ذی حیات ہیں انسانوں کی طرح ذی حیات" [2]

جوش نے لفظوں کو بھی اپنی ندرت تخیل اور ادائیگی کے انوکھے پن سے تازگی اور شگفتگی بخشی ہے۔ لفظوں کے ذریعہ ہی انھوں نے غیر مرئی چیزوں کو مرئی بنا کر اور لطیف سے لطیف تر بنا کر پیش کر دیا۔ الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں اب تک انیس کا مدِمقابل کوئی شاعر

---

[1] "تنقیدی زاویے" از ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۰۲

[2] "الفاظ اور شاعری" مطبوعہ ماہنامہ "افکار" جوش نمبر کراچی ۱۹۶۱ء ص ۵۰۲

منظر نہیں آتا تھا مگر اب ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ اردو شاعری میں جوش سے زیادہ الفاظ کا ذخیرہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جوش نے اپنی شاعری میں عام فہم اور موزوں الفاظ کو ہی موقع اور محل کے اعتبار سے ہی جگہ دی ہے الفاظ پر زبردست قدرت کے باوجود لفظوں کی جادوگری کے وہ کبھی اسیر نہیں ہوئے جوش نے اپنی نظموں سے اردو شاعری کو ایک مردانہ لب و لہجہ عطا کیا اردو شاعری میں اس قسم کی بلند بانگ لے اب تک سنائی نہیں دی تھی اور جس زمانے میں جوش نے شاعری کی اس زمانے میں "لکھنؤ" میں نسوانیت کا دور دورہ تھا مگر اس کے باوجود جوش کی آواز مردانگی کی گھن گرج سے گونجی اور اپنی انفرادیت اور معنویت کا لوہا منوا کر رہی ان کی بیشتر نظموں میں خطابت کا انداز ملتا ہے جو کچھ لوگوں کو برا بھی لگتا ہے۔ مگر ان کو جوش کے دور اور اس وقت کے حالات و اسباب پر نظر ڈالنے پر صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ خطابت اس وقت کتنی جرات مندانہ چیز تھی اور کس قدر ضروری بھی۔

جوش نے اپنی نظموں میں تشبیہات اور تراکیب سے حسن پیدا کیا ہے مگر انھیں ان کے استعمال کا صحیح سلیقہ بھی تھا جس کی وجہ سے انھوں نے جہاں تشبیہ اور استعارے کو اس کی فضا اور موقع محل کے اعتبار سے استعمال کیا وہیں تازگی اور ندرت پیدا ہو گئی ہے انھوں نے فضا کو رنگین بنانے کے لئے بھی تشبیہات اور استعارات سے مدد لی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ۔

"اردو شاعری کے پورے سرمائے میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنی تشبیہیں اور استعارے اور IMAGES استعمال کی ہوں" [۱]

آل احمد سرور نے بھی ان کی تشبیہات کی دل کشی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے

"ان کی تشبیہات جاندار، دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں ان کا تخیل لاکار ہے مگر دور رس نہیں .... انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے" [۲]

---

[۱] "جوش کی شاعری" مطبوعہ ماہنامہ "افکار" جوش نمبر کراچی ۱۹۶۱ء ص ۲۴۴

[۲] "ادب اور نظریہ" از پروفیسر آل احمد سرور ص ۲۰۲

اس مقالے میں جوش ملیح آبادی کی شاعری ہی سے بحث کی گئی ہے اور ان کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ کیونکہ اردو ادب میں جوش کی بنیادی حیثیت ایک اہم ترین شاعر ہی کی ہے تاہم "یادوں کی برات" کی اشاعت کے بعد سے ادب کے ناقدین جوش کی نثری نگارشات کو بھی اہمیت دینے لگے ہیں۔

ویسے تو جوش کے نثری رشحات قلم پہلی مرتبہ "روح ادب" کے ذریعہ منظر عام پر آئے تھے جس میں رومانوی وفور اور ٹیگوریت کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے لیکن جب انھوں نے ماہنامہ "کلیم" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کے لئے مختلف عصری مسائل پر اداریے لکھنے شروع کئے تو صرف ان کا رومانوی وفور بڑی حد تک کم ہو گیا بلکہ ان کی نثر میں تعمیق کا عمل بھی نمایاں نظر آنے لگا۔

حال ہی میں جوش کے علمی وادبی مضامین اور انشائیوں کا ایک مجموعہ "مقالات جوش" عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں مختلف موضوعات اور مسائل پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے جوش کے تقریباً سارے مضامین یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ "روح ادب"، "مقالات جوش" اور "یادوں کی برات" کو پیش نظر رکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور ایک نثر نگار کی حیثیت سے ان کے مقام کا تعین کیا جائے

بحیثیت مجموعی جوش اپنے دور کے ایک اہم شاعر ہیں جس طرح ہم نظیر اکبر آبادی کو ان کے دور سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے اسی طرح جوش کو بھی ان کے دور کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے وہ اپنے عہد کی پیداوار تھے اور انھوں نے اپنے عہد کو اپنے افکار سے نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اپنی انفرادیت کو بھی تسلیم کرا لیا ہے خصوصی طور سے اردو نظم پر جوش کے زبردست احسانات ہیں انھوں نے اردو شاعری کی اس صنف میں بہ اعتبار موضوعات، بہ اعتبار ہیئت، بہ اعتبار مضامین زبردست اضافے کئے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے بعد جوش ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اردو کے ذخیرہ الفاظ میں زبردست اضافہ کیا ہے

جوش کی شاعری پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے موضوعات وقتی اور ان کی شاعری احتجاجی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس شاعری کا بھی ایک زمانہ تھا اور وہ زمانہ ہماری جدوجہد آزادی کا وہ اہم دور تھا جب انقلابی اور باغیانہ جذبات کی اہمیت تھی۔ جوش نے اپنی شاعری کے ذریعہ غلامی سے نفرت

کا احساس دلایا اور آزادی کے لئے قربانی کے جذبہ کو بیدار کیا۔ آزادی کے بعد ذہنی غلامی اور سیاستدانوں کی ریشہ دوانیاں اور مذہبی استحصال ان کی شاعری کا اہم موضوع رہے۔

جوش کی زندگی کے آخری دن نہایت کشمکش اور کسمپرسی کے عالم میں گزرے وہ اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں جس قدر مطمئن اور خوش حال تھے ان کا بڑھاپا اس کے برعکس تھا۔ پاکستان کی ہجرت انھیں راس نہ آئی ان کی امیدوں اور آرزؤں نے وہاں دم توڑ دیا۔ لیکن اعلانِ حق انھیں وہاں بھی نہ روک سکا اور اس کی پاداش میں ان پر حکومتِ وقت کے کئی عتاب بھی نازل ہوئے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ان کو پروگرام دیئے بند کر دیئے گئے۔ ان کی کتاب "یادوں کی برات" ضبط کر لی گئی اور ان کو جو مراعات ابتداً دی گئی تھیں انھیں منسوخ کر دیا گیا۔

جوش کا عہد تاریخ کا اہم دور تھا۔ اور جوش اس عہد کے نمائندہ تھے ان کے لئے یہ اعزاز ہی کیا کم ہے کہ وہ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ پر اپنے افکار کی امٹ چھاپ چھوڑ گئے ہیں جسے اردو شاعری کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

# کتابیات

## بنیادی ماخذات :


| | | | |
|---|---|---|---|
| اشارات | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۴۲ء |
| اوراقِ سحر | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۲۱ء |
| آیات و نغمات | جوشؔ ملیح آبادی | پہلا ایڈیشن | ۱۹۴۱ء |
| جنون و حکمت | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۳۶ء |
| حرف و حکایت | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۳۸ء |
| روحِ ادب | جوشؔ ملیح آبادی | پہلا ایڈیشن | ۱۹۲۶ء |
| سنبل و سلاسل | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۴۶ء |
| سیف و سبو | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۴۶ء |
| شعلہ و شبنم | جوشؔ ملیح آبادی | دوسرا ایڈیشن | ۱۹۳۹ء |
| عرش و فرش | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۴۴ء |
| فکر و نشاط | جوشؔ ملیح آبادی | دوسرا ایڈیشن | ۱۹۳۹ء |
| رامش و رنگ | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۴۵ء |
| نقش و نگار | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۳۶ء |
| یادوں کی برات | جوشؔ ملیح آبادی | | ۱۹۷۲ء |


## ثانوی ماخذات :


| | | |
|---|---|---|
| اثرؔ کے تنقیدی مضامین | جعفر علی خاں اثرؔ | ۱۹۵۶ء |

## قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات
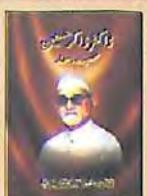
ISBN: 978-81-7587-352-0

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

**National Council for Promotion of Urdu Language**

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025